اسلام اور جدت پسندی

محمد تقی عثمانی

مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴

اسلام اور جدّت پسندی

محمد تقی عثمانی

مکتبہ دار العلوم کراچی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

حرفِ آغاز

عصر حاضر میں اسلام کے عملی نفاذ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نت نئے پیدا ہونے والے مسائل کے اسلامی حل کے موضوع پر میں پچھلے تیس سال سے اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہوں، اور ان میں سے بیشتر مضامین ماہنامہ "البلاغ" میں شائع ہو رہے ہیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے اس قسم کے مضامین کا ایک مجموعہ "عصر حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل تھا۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی احقر کو اسی موضوع کے دوسرے گوشوں پر بہت سے مضامین لکھنے کا اتفاق ہوا، اور احباب کی طرف سے یہ خواہش سامنے آئی کہ ان نئے مضامین کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اگر اس کتاب میں ان مضامین کا اضافہ کیا جائے تو وہ بہت ضخیم کتاب ہو جائے گی، اور ایک تو ضخامت کی وجہ سے اس سے استفادہ مشکل ہو جائے گا۔ دوسرے یہ مضامین سیاست، قانون، معیشت، تعلیم، معاشرت اور انفرادی اصلاح وغیرہ کے مختلف ابواب پر منقسم ہیں۔ اور اتنی ضخیم کتاب کا حصہ بننے کا ایک نقصان یہ ہوگا کہ اگر کوئی صاحب ان میں سے صرف کسی ایک موضوع کے مضامین سے دلچسپی رکھتے ہوں تو انہیں یہ پوری ضخیم کتاب لینی پڑے گی جس کے بہت سے ابواب شاید ان کے لئے مفید مطلب نہ ہوں۔

اس بناء پر میں نے مناسب سمجھا کہ اب ان مضامین کو ایک کتاب میں جمع کرنے کے بجائے ہر موضوع پر الگ الگ مجموعے تیار کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ چنانچہ احقر نے مندرجہ ذیل مختلف عنوانات قائم کر کے ہر عنوان پر ایک مجموعہ مضامین کتابی شکل میں ترتیب دیا ہے:۔ (۱) نفاذ شریعت اور اس کے مسائل (۲) اسلام اور سیاست حاضرہ (۳) اسلام اور جدت پسندی (۴) ہمارا تعلیمی نظام (۵) فرد کی اصلاح (۶) سیرت طیبہ (۷) اصلاح معاشرہ (۸) ہمارا معاشی نظام (۹) مسلمان اور قادیانیت

ان مجموعوں میں سے اس وقت ایک مجموعہ "اسلام اور جدت پسندی" پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کو مسلمانوں کے لئے مفید بنائیں، اور یہ احقر کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو۔ آمین

محمد تقی عثمانی

۱۳/ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

اسلام اور جدت پسندی

"جدت پسندی" بذات خود ایک مستحسن جذبہ اور انسان کی ایک فطری خواہش ہے، اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کے زمانے سے ایٹم کے دور تک نہ پہنچتا، اونٹوں اور بیل گاڑیوں سے طیاروں اور خلائی جہازوں تک رسائی حاصل نہ کرتا، موم کی شمعوں اور مٹی کے چراغوں سے بجلی کے قمقموں اور سرچ لائٹوں تک ترقی نہ کر سکتا۔ انسان کی یہ ساری مادی ترقیاں اور سائنٹفک فتوحات جنھوں نے ایک طرف چاند تاروں پر کمندیں ڈال رکھی ہیں تو دوسری طرف سمندر کی تہ میں اپنے ڈول پہنچائے ہوئے ہیں، اگر دیکھا جائے تو انسان کے اسی جذبہ کی رہین منت ہیں کہ وہ "جدت پسند" اور "خوب سے خوب تر" کا حریص ہے۔

چنانچہ اسلام نے جو ایک فطری دین ہے، کسی "جدت" پر بحیثیت "جدت" کے کوئی پابندی عائد نہیں کی، بسا اوقات اسے مستحسن قرار دیا ہے اور اس کی ہمت افزائی کی ہے۔

خاص طور سے صنعت و حرفت اور فنون جنگ وغیرہ کے بارے میں نئے نئے طریقوں کا استعمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے غزوۂ احزاب کے موقع پر جب قبائل عرب نے اکٹھے ہو کر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کا پروگرام بنایا تو ان کے دفاع کے لئے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ایک نئی تدبیر بتلائی جس پر عرب میں اس سے پہلے عمل نہیں ہوا تھا اور وہ تدبیر یہ تھی کہ شہر کے اطراف میں ایک گہری خندق کھودی جائے۔ چنانچہ آپ نے اس تدبیر کو پسند فرما کر اس پر عمل کیا۔ اور خود بھی خندق کی کھدائی میں شریک رہے (البدایہ والنہایہ ۴: ۹۵)

ان ہی حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے غزوۂ طائف کے موقع پر آپؐ نے دو نئے آلات حرب استعمال فرمائے جو بعض روایات کے مطابق حضرت سلمانؓ نے خود اپنے ہاتھ سے بنائے تھے ان میں ایک منجنیق تھی، جسے اس زمانے کی توپ کہنا

چاہئے، اور دو دبابے تھے جنہیں اس دور کے ٹینک کہا جا سکتا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ۴: ۳۴۸)

پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ حافظ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے دو صحابیوں حضرت عروہ بن مسعودؓ اور حضرت غیلان بن سلمہؓ کو باقاعدہ شام کے شہر جرش بھیجا، تاکہ وہ وہاں سے دبابے، منجنیق اور ضبور کی صنعت سیکھ کر آئیں۔ جرش شام کا مشہور صنعتی شہر تھا، اور ضبور، دبابے ہی کی طرح کا ایک آلہ تھا جسے اہل روم جنگوں میں استعمال کرتے تھے، چنانچہ یہ دونوں صحابی غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف میں اسی لئے شریک نہ ہو سکے کہ وہ ان دنوں شام میں یہ صنعت سیکھ رہے تھے۔

(طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۱، تاریخ طبری ج ۲ ص ۳۵۳، البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۳۴۵)

حافظ ابن جریرؒ نقل کرتے ہیں کہ زراعت کی ترقی کے لئے آپؐ نے اپنی امت کو زیادہ سے زیادہ کاشت کرنے کا حکم دیا، اور پیداوار بڑھانے کے لئے یہ تدبیر بتائی کہ کھیتوں میں اونٹوں کی کھوپڑیاں استعمال کیا کریں۔
(کنز العمال ج ۲ ص ۲۰۹ انواع الکسب)

ایک حدیث میں ہے کہ تجارت کی ترقی کے لئے آپؐ نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ کپڑے کی تجارت کرو، کیونکہ کپڑے کا تاجر یہ چاہتا ہے کہ لوگ خوشحال اور فارغ البال رہیں۔ (کنز العمال ج ۲ ص ۱۹۹، بحوالہ انواع الکسب)

نیز آپؐ نے متعدد لوگوں کو تجارت کے لئے عمان اور مصر جانے پر آمادہ فرمایا۔ (کنز العمال ج ۲ ص ۱۹۷)

زراعت اور معدنیات سے فائدہ اٹھانے کے لئے آپ نے ارشاد فرمایا

اطلبوا الرزق فی خبایا الارض

یعنی زمین کی پوشیدہ نعمتوں میں رزق تلاش کرو (کنز العمال ج ۲ ص ۱۹۷)

عرب کے لوگ بحری بیڑے سے نا آشنا تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسرت کے ساتھ پیشین گوئی فرمائی کہ میری امت کے کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے سمندری موجوں پر اس طرح سفر کریں گے جیسے تخت نشین بادشاہ۔ (صحیح بخاری کتاب الجہاد)

اور پھر مسلمانوں کی بحری جنگوں کے بڑے فضائل بیان فرمائے۔ چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پہلا بحری بیڑا تیار کیا، اور اس سے

مسلمانوں کی تگ و تاز قبرص، روڈس، کریٹ اور صقلیہ تک پہنچ گئی۔ یہاں تک پورا بحیرۂ روم ان کے لئے مسخر ہو گیا جس کی طرف اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ ۔

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۸ھ میں لخم اور جذام کے خلاف جنگ ذات السلاسل کے دوران پہلی بار بلیک آؤٹ کا طریقہ اختیار فرمایا اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ لشکر گاہ میں تین روز تک رات کے وقت کسی طرح کی روشنی نہ کریں اور نہ آگ جلائیں جب لشکر مدینہ طیبہ پہنچا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس عمل کی وجہ دریافت فرمائی حضرت عمرو بن العاص ؓ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! میرے لشکر کی تعداد دشمن کے مقابلہ میں کم تھی۔ اس لئے میں نے رات کو روشنی کرنے سے منع کیا کہ مبادا دشمن ان کی قلت تعداد کا اندازہ لگا کر شیر نہ ہو جائے" رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنگی تدبیر کو پسند فرما کر اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا (جمع الفوائد ج ۲ ص ۲۷)

غرض یہ عہد رسالت ؐ کی چند متفرق مثالیں تھیں جو سرسری طور سے یاد آگئیں، مقصد یہ تھا کہ اسلام نے کسی جدید اقدام پر جدید ہونے کی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ صحیح مقاصد کے لئے صحیح حدود میں رہ کر جدت پسندی کی ہمت افزائی کی ہے۔

لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جس طرح جدت پسندی نے انسان کو مادی ترقی کے بام عروج تک پہنچایا ہے، اسے نئی نئی ایجادات عطا کی ہیں، اور راحت و آسائش کے بہتر طریقے مہیا کئے ہیں اسی طرح اس نے انسان کو بہت سے نفسانی امراض میں بھی مبتلا کیا ہے اور بہت سے تباہ کن نقصانات بھی پہنچائے ہیں۔ اسی جدت پسندی کی بدولت انسان کی تاریخ فرعونوں اور شدادوں سے بھری ہوئی ہے جنہیں طاقت واقتدار کی کسی حد پر قرار نصیب نہیں ہوا، بلکہ وہ اقتدار کے شوق میں حکومت اور بادشاہی سے گزر کر خدائی کے دعویدار بن بیٹھے، اسی جدت پسندی نے ہٹلر اور مسولینی کو بھی جنم دیا جن کی ہوس ملک گیری ہر روز ایک نئے خطہ زمین کا اقتدار چاہتی تھی، اسی جدت پسندی نے آج پوری دنیا میں عریانی و فحاشی کا طوفان بپا کر رکھا ہے، اور باہمی رضامندی سے زنا کو سند جواز دے رکھی ہے، بلکہ اب تو برطانیہ کے دارالعوام سے تائیں

کی کوکھ میں ہم جنس پرستی کے جواز کا بل بھی منظور کرالیا ہے، یہی جدت پسندی ہے جس کے سائے میں مغربی عورتیں اسقاط حمل کے جواز کا مطالبہ کرنے کے لئے برسرِ عام بینر اٹھائے پھر رہی ہیں۔ اور یہی جدت پسندی ہے جسے بطور دلیل استعمال کر کے محرم عورتوں سے شادی رچانے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ "جدت پسندی" ایک دودھاری تلوار ہے جو انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے کام بھی آسکتی ہے، اور اس کا کام تمام بھی کر سکتی ہے لہٰذا ایک جدید چیز نہ محض نئی ہونے کی بناء پر قابل قبول ہے، ورنہ محض نئی ہونے کی بناء پر قابل تردید۔ یہاں تک تو بات صاف ہے لیکن آگے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ کیا معیار ہے جس کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ فلاں جدت مفید اور قابل قبول ہے اور فلاں مضر اور ناقابل قبول؟

اس معیار کے تعین کے لئے ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ کام خالص عقل کے حوالے کیا جائے، چنانچہ سیکولر معاشروں میں یہ فیصلہ عقل ہی کے پاس ہوتا ہے لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ جن جن لوگوں نے "جدت پسندی" کے نام پر انسانیت سے اخلاق و شرافت کے سارے اوصاف لوٹ کر اسے حیوانیت اور درندگی کے راستے پر ڈالا وہ سب عقل و دانش کے دعویدار تھے اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے عقل خالص کو اپنا رہنما نہ بنایا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہونے کے بعد "عقل" کی مثال ایک ایسے ہرجائی محبوب کی سی ہوتی ہے جسے متضاد قسم کے لوگ بیک وقت اپنا سمجھتے ہیں، اور درحقیقت وہ کسی کا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسی "عقل" میں بُرے سے بُرے نظریئے اور بُرے سے بُرے عمل کی بھی شاندار اور خوبصورت توجیہات مل جاتی ہیں۔ مثلاً ہیروشیما اور ناگا ساکی کا نام سن کر انسانیت کی پیشانی آج بھی عرق عرق ہو جاتی ہے لیکن انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جیسی علمی اور عالمی کتاب میں ان تباہ کاریوں کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے جو ایٹم بم کی بدولت ہیروشیما اور ناگا ساکی میں برپا ہوئیں، لیکن ایٹم بم کے تعارف میں یہ جملہ سب سے پہلے لکھا ہے کہ:-

"Former Prime Minister Winston churchill estimated that by shortening the war The atomic bomb had saved the lives of 1000,000 u. s soldiers 250,000 Birtish Soldiers"

(بریٹینیکا ج ۲ ص ۷۲۳ اے مطبوعہ ۱۹۵۵ء مقالہ: ایٹم بم)

یعنی "سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے اندازہ لگایا ہے کہ ایٹم بم نے جنگ کو مختصر کر کے دس لاکھ امریکی سپاہیوں اور ڈھائی لاکھ برطانوی سپاہیوں کی جانیں بچائی ہیں۔" اندازہ لگائیے کہ اس قسم کی منطق کی روشنی میں کون سا ظلم و ستم اور کون سی سفاکی ایسی ہے جسے عقل کے خلاف کہا جا سکے؟

اس طرح کی عقلی توجیہات کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن میں شرم و حیا سے معذرت کے ساتھ ایک مثال اور پیش کروں گا، جس کی روشنی میں عقل خالص کی صحیح پوزیشن اچھی طرح واضح ہو سکتی ہے تاریخ اسلام میں ایک فرقہ "باطنیہ" کے نام سے گزرا ہے، اس کا ایک مشہور لیڈر عبید اللہ القیروانی اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے:

او ما العجب من شئی کالعجب من رجل یدعی العقل ثم یکون له اخت او بنت حسناء، ولیست له زوجة فی حسنها فیحرمها علی نفسه وینکحها من اجنبی ولو عقل الجاهل لعلم انه احق باخته وبنته من الاجنبی وما وجه ذالك الا ان صاحبهم حرم علیهم الطیبات الخ۔

(الفرق بین الفرق لعبد القاهر البغدادی ص ۲۹۷ طبع مصر)

یعنی "اس سے زیادہ تعجب کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص عقل کا دعویدار ہونے کے باوجود ایسی حماقتیں کرتا ہے کہ اس کے پاس نہایت خوبصورت بہن یا بیٹی موجود ہوتی ہے اور خود اسکی بیوی اتنی حسین نہیں ہوتی مگر وہ اس خوبصورت بہن یا بیٹی کو اپنے اوپر حرام قرار دے کر اسے کسی اجنبی سے بیاہ دیتا ہے۔ حالاں کہ ان جاہلوں کو اگر عقل ہوتی تو وہ یہ سمجھتے کہ ایک اجنبی شخص کے مقابلے میں اپنی بہن اور بیٹی کے وہ خود زیادہ حق دار ہیں۔ اس بے عقلی کی وجہ دراصل صرف یہ ہے کہ ان کے آقا نے ان پر عمدہ چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔"

اس گھناؤنی عبارت کی شناعت و خباثت پر جتنی چاہے لعنت بھیجتے رہئے۔ لیکن دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ جو عقل وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس کے پاس اس دلیل کا کوئی خالص عقلی جواب ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک آزاد اور لبرل عقل کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے، چنانچہ صدیوں کے بعد عبید اللہ قیروانی کا یہ خواب اب شرمندہ تعبیر ہو رہا ہے، اور بعض مغربی ممالک میں بہن سے شادی کرنے کی آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ "جدت پسندی" کی رو میں اگر اچھے برے کا فیصلہ خالص عقل پر چھوڑا جائے تو ایک طرف اس سے زندگی کی کوئی قدر صحیح سالم نہیں رہتی، اور دوسری طرف چونکہ ہر شخص کی عقل دوسرے سے مختلف ہے اس لئے انسان متضاد آراء اور نظریات کی ایسی بھول بھلیوں میں پھنس جاتا ہے جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اسی کی وجہ یہ ہے کہ جو عقل وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہو، انسان اسے آزاد عقل سمجھتا ہے لیکن درحقیقت وہ اس کی بہیمی خواہشات اور نفسانی اغراض کی غلام بن جاتی ہے جو عقل کی غلامی کی بدترین شکل ہے۔ اسی لئے قرآن کریم کی اصطلاح میں ایسی عقل کا نام "ھویٰ" (خواہش نفس) ہے۔ اور اسی کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

ولو اتبع الحق اهواءهم لفسدت السمٰوات والارض ومن فيهن

اور اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کا تابع ہو جائے تو آسمان و زمین اور ان کی مخلوقات میں سخت بگاڑ پیدا ہو جائے۔

فلسفہ قانون کی بحث میں فلاسفہ کے ایک گروہ کا تذکرہ آتا ہے جس کے نظریہ اخلاق کو (Cognitvist Theory) کہا جاتا ہے، مشہور ماہر قانون ڈاکٹر فرائڈ مین نے اس نظریے کا خلاصہ اپنی کتاب (Legal Theory) میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"Reason is and ought only to be the slave of the passions and can never pretend to any other office than to serve and obey them" (P.36)

یعنی عقل صرف انسانی جذبات و خواہشات کی غلام ہے، اور اس کو اسی کا غلام ہونا بھی چاہئے، عقل کا اس کے سوا کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ان جذبات کی بندگی اور ان کی اطاعت کرے"

اس نظریے سے حاصل ہونے والا نتیجہ ڈاکٹر فرائڈ مین کے الفاظ میں یہ ہے:

"Every thing else but also words like 'good' 'bad'

'ought' 'worthy' are purely emotive. and there cannot be such a thing as ethical or moral science" (p.p 36,37

"اس کے سوا ہر چیز یہاں تک کہ اچھے برے کے تصورات اور یہ الفاظ کہ فلاں کام ہونا چاہئے اور "فلاں کام ہونے کے لائق ہے" کلی طور پر جذباتی باتیں ہیں اور دنیا میں علم اخلاق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔"

یہ نظریہ فلسفہ قانون کی بنیاد بننے کے لئے خواہ کتنا غلط اور برا ہو، لیکن ایک سیکولر عقلیت کی بڑی سچی اور حقیقت پسندانہ تعبیر ہے، واقعہ یہی ہے کہ سیکولر عقل کی پیروی کا لازمی نتیجہ اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتا کہ دنیا میں اخلاق نام کی کسی چیز کا وجود باقی نہ رہے۔ اور انسان کے قول و فعل پر اس کے نفسانی جذبات کے سوا کسی چیز کی حکمرانی قائم نہ ہو۔ سیکولر عقلیت اور "اخلاق" درحقیقت جمع ہو ہی نہیں سکتے، کیوں کہ "جدت پسندی" کی رو میں ایک مرحلہ ایسا آ جاتا ہے جب انسان کا ضمیر ایک عمل کو برا سمجھتا ہے، لیکن وہ اسے اختیار کرنے پر اس لئے مجبور ہوتا ہے کہ "جدت پسندی" اور سیکولر عقلیت کے پاس اسے رد کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ مغرب کے اہل فکر آج اسی عبرتناک بے بسی سے دوچار ہیں۔ "ہم جنس پرستی" کا جو قانون چند سال پہلے برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کیا ہے، برطانیہ کے مفکرین کی ایک بڑی تعداد اسے اچھا نہیں سمجھتی تھی، لیکن اسے تسلیم کرنے پر اس لئے مجبور تھی کہ خالص عقلی "جدت پسندی" کے مذہب میں جس جس برائی کا چلن عام ہوتا جائے اسے قانونی جواز عطا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ولفنڈن کمیٹی جو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بیٹھی تھی اس کے یہ الفاظ کتنے عبرت خیز ہیں کہ:

"Unless a deliberate attempt is made by society acting throug the agency of the law to equate this fear of crime with that of sin, there must remain a realm of private morality and immorality which in brief and crude terms, not the laws business. (The legal Theory)

"جب تک قانون کے زیر اثر چلنے والی سوسائٹی کی طرف سے اس بات کی سوچی بھی کوشش نہیں کی جاتی کہ جرم کا خوف گناہ کے برابر ہو جائے اس وقت تک پرائیویٹ اخلاق اور بد اخلاق کے تصور کی حکمرانی برقرار رہے گی، جو مختصر تر کرے لفظوں میں قانون کے دائرہ کار سے باہر ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر "اچھے برے" کا تمام تر فیصلہ "خالص عقل" کے حوالے کیا جائے تو انسان کے پاس کوئی ایسا معیار باقی ہی نہیں رہتا جس کی بنیاد پر وہ کسی نئے رواج کو روک سکے۔ بلکہ ہر قیمتی سے قیمتی اخلاقی قدر بھی "جدت پسندی" کے سیلاب میں بہہ جاتی ہے۔

آج مفکرین قانون کو اس بات پر سخت تشویش ہے کہ "جدت پسندی" کی عام روش کی موجودگی میں وہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے کم از کم کچھ اعلیٰ اخلاقی اوصاف محفوظ اور ناقابل تغیر رہ سکیں۔ چنانچہ ایک امریکی جج جسٹس کارڈوزو (Carduzo) لکھتے ہیں۔

" آج قانون کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسا فلسفہ قانون مرتب کیا جائے جو ثبات اور تغیر کے متضاد اور متحارب تقاضوں کے درمیان کوئی موافقت پیدا کر سکے۔ "

(The Growth of the Law)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کام کسی عقلی فلسفے کے بس کا نہیں ہے۔ یہ ساری خرابی پیدا یہاں سے ہوئی ہے کہ وحی الٰہی کا کام عقل کے سر ڈال کر اس پر وہ بوجھ لاد دیا گیا ہے جس کی وہ متحمل نہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی قانون کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ دائمی اور ناقابل تغیر ہے کسی دلیل ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے، اور انسانی عقل ایسی کوئی دلیل پیش کرنے سے عاجز ہے۔ آج کچھ لوگ ایک قانون کو اپنی عقل کی بنیاد پر ناقابل تغیر قرار دیں گے۔ کل دوسرے لوگوں کو اندازہ ہو گا کہ وہ دائمی قانون بننے کے لائق نہ تھا، چنانچہ وہ پھر اس کے قابل تغیر ہونے کا اعلان کر دیں گے۔ لہٰذا اس مسئلے کا اگر کوئی حل ہے تو وہ سوائے اس کے نہیں کہ انسان اپنی عقل کو نفسانی خواہشات کا غلام بنانے کے بجائے اس ذات کا غلام بنائے جس نے اسے اور پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ وہ چونکہ دنیا میں واقع ہونے والے تمام تغیرات سے پوری طرح باخبر ہے، اس لئے یہ بات اس کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا کہ قانون کے کون سے اصول ناقابل تغیر ہیں۔ اصول قانون کے مشہور مصنف جارج پیٹن نے بالکل سچی بات لکھی ہے کہ:

"What interests should the real legal system protect?

This is a question of values, in which legal philsophy plays its part ..... But however much we desire the help of philosophy, it is difficult to obtain. No agreed scale of values has ever been reached indeed, it is only in religion that we can find a basis, and the truths of religion must be accepted by faith or intuiton and not purely as the result of logical argument

(Paton:jurisprudence P.121)

ایک مثالی قانونی معاشرے کو کن کن مفادات کا تحفظ کرنا چاہئے؟ یہ ایک اقدار کا سوال ہے جس میں فلسفۂ قانون اپنا کردار ادا کرتا ہے ..... لیکن اس معاملے میں ہم فلسفے سے جتنی جتنی مدد مانگتے ہیں، اتنی ہی اس سے اس سوال کا جواب ملنا مشکل ہے۔ کیوں کہ اقدار کا کوئی متفقہ پیمانہ اب تک دریافت نہیں ہو سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف مذہب ایسی چیز ہے جس میں ہمیں ایک بنیاد ملتی ہے، اور مذہب کے حقائق کو بھی عقیدے کے ذریعے قبول کرنا چاہئے نہ کہ خالص منطقی استدلال کے نتیجے کے طور پر۔

خلاصہ یہ کہ زمانے کی جدتوں میں اچھے برے کا فیصلہ کرنے کے لئے سیکولر عقل قطعی ناکام ہو چکی ہے، لہٰذا اس مسئلے کے حل کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون سے رہنمائی حاصل کرے۔ انسانیت کی نجات کی اس کے سوا کوئی سبیل نہیں۔ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

افمن کان علی بینۃ من ربہ کمن زین لہ سوء عملہ واتبعوا اھواءھم (محمد : ١٤)

"تو جو لوگ اپنے پروردگار کے واضح راستے پر ہوں کیا وہ ان لوگوں کی طرح ہو سکتے ہیں جن کی بدعملی ان کو بھلی معلوم ہوتی ہو اور جو اپنی نفسانی خواہشات پر چلتے ہوں۔" (محمد: ۱۴)

لہٰذا مسئلہ کا واحد حل یہی ہے کہ زمانے کے ہر نئے طور طریق اور ہر نئے رسم و رواج کو اس کی ظاہری چمک دمک کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس بنیاد پر جانچا جائے کہ وہ "پروردگار کے راستے" کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور اگر اس کے بارے میں اللہ اور اس کی شریعت کا کوئی حکم آجائے تو اسے بے چون و چرا تسلیم کیا جائے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وما کان لمومن و لا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم

(احزاب)

کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی
معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اس معاملے میں اس کو اختیار باقی
رہے۔

اور:۔

فلا و ربك لا یؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً
مما قضیت و یسلموا تسلیما

پس اے نبی! نہیں، آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن
نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو اپنے باہمی تنازعات میں فیصل نہ مانیں، پھر جو کچھ
آپ فیصلہ کریں اس کے بارے میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں،
اور اسے پوری طرح تسلیم کر لیں۔ (نساء)

اللہ تعالیٰ نے جو احکام اپنی کتاب یا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عطا فرمائے ہیں
وہ انہی مسائل سے متعلق ہیں کہ اگر ان کو عقل خالص کے حوالے کیا جاتا تو وہ انسان کو گمراہی
کی طرف لے جا سکتی تھی اور چونکہ اللہ تعالیٰ ماضی و مستقبل کے تمام حالات سے باخبر ہے، اس
لئے صرف اسی کے احکام ہر دور میں واجب العمل ہو سکتے ہیں،

چنانچہ ارشاد ہے:۔

یبین اللہ لکم ان تضلوا واللہ بکل شئی علیم (نساء)

"اللہ تمہارے لئے کھول کھول کر یہ باتیں اس لئے بیان کرتا ہے کہ کہیں تم
گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔"

یہیں سے "جدت پسندی" کے بارے میں ایک اور بات واضح ہو جاتی ہے، اور وہ یہ کہ وحی الٰہی
اور احکام شریعت کی ضرورت چونکہ اس لئے پڑی ہے کہ نری عقل کے ذریعہ ان معاملات میں
ہدایت تک پہنچنا مشکل تھا اس لئے ہدایت کے لئے احکام الٰہی کا جوں کا توں اتباع ضروری ہے
اور یہ طرز عمل درست نہیں کہ زمانے کے کسی چلن کو پہلے اپنی عقل سے صحیح اور بہتر قرار دے
لیا جائے، اور اس کے بعد قرآن و سنت کو اپنے اس عقلی فیصلے پر فٹ کرنے کے لئے ان میں کھینچ
تان اور دور از کار تاویلات کا طریقہ اختیار کیا جائے، کیوں کہ یہ طرز عمل احکام الٰہی کا اتباع

نہیں کہا جا سکتا، یہ اجتہاد کے بجائے ترمیم و تغیر ہے جس کا کسی انسان کو اختیار نہیں، کیوں کہ اس سے احکام الٰہی کا مقصد نزول ہی تلپٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اجتہاد یہ ہے کہ انسان ہر حال میں احکام الٰہی کو کامل اور مکمل یقین کر کے کسی ترمیم کے بغیر انہیں قبول کر لے اور اگر روئے زمین کے تمام لوگ مل کر بھی چاہیں تو اسے احکام الٰہی سے اعراض پر آمادہ نہ کر سکیں۔ ارشاد ہے:۔

وتمت کلمت ربک صدقا و عدلا لا مبدل لکلمٰتہ وھو السمیع العلیم ہو ان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن و ان ھم الا یخرصون ہ ان ربک ھو اعلم من یضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین (انعام: ۱۱۵ تا ۱۱۷)

"اور آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے لحاظ سے مکمل ہے، کوئی اس کے کلام کو بدلنے والا نہیں اور وہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر آپ دنیا کے اکثر لوگوں کا کہا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے، وہ تو محض گمان کا اتباع کرتے ہیں، اور بالکل اٹکل پچّو باتیں کرتے ہیں۔ بلاشبہ آپ کا رب ہی خوب جانتا ہے ان کو بھی جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور خوب جانتا ہے ان کو بھی جو ہدایت یافتہ ہیں۔"

ارشاد ہے:۔

قال الذین لا یرجون لقاءنا ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی (یونس: ۱۵)

جو لوگ ہم سے ملاقات (یعنی آخرت) کا یقین نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لے آؤ یا اسی کو کچھ بدل دو۔ آپ کہہ دیجئے کہ مجھے یہ حق نہیں کہ میں اس کو بدلوں میں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔

اس قسم کے اجتہاد میں بعض اوقات زمانے کی مخالفت بھی مول لینی پڑتی ہے اور اس کی وجہ سے مشکلات بھی پیش آ سکتی ہیں، لیکن جو لوگ ان آزمائشوں کا مقابلہ کرتے ہیں انہیں اللہ کی طرف سے دنیا اور آخرت دونوں میں ہدایت نصیب ہوتی ہے، ارشاد ہے:۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا و ان اللہ لمع المحسنین (العنکبوت : ۶۹)

"اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں، ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے، اور بلاشبہ اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔"
(عنکبوت : ۶۹)

یہ طرز عمل درست نہیں کہ اگر کسی حکم الٰہی میں کوئی ظاہری فائدہ نظر آئے تو اسے قبول کر لیا جائے، اور جہاں کچھ مشکلات اور آزمائشیں ہوں وہاں اعراض یا تاویل سازی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس طرز عمل میں قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے۔

و من الناس من یعبد اللہ علی حرف فان اصابہ خیر اطمأن بہ و ان اصابتہ فتنۃ انقلب علی وجھہ خسر الدنیا و الآخرۃ ذالک ھو الخسران المبین (حج : ۱۱)

"اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کی بندگی کنارے پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں، پس اگر ان کو کوئی دنیوی نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے مطمئن ہو جاتے ہیں، اور اگر کوئی آزمائش آئی تو منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ اٹھاتے ہیں۔ یہی تو کھلا ہوا نقصان ہے۔"

غرض اسلامی نقطۂ نظر سے اچھی اور بری بدعتوں کو پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ اللہ کی شریعت نے اس کے بارے میں کیا حکم فرمایا ہے؟ اگر وہ شریعت کے احکام کے مطابق ہے تو اسے قبول کیا جائے، اور اگر شریعت کے احکام کے خلاف ہے تو شریعت میں تاویل و تحریف کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے اسے چھوڑ دیا جائے خواہ وہ زمانے کے عام چلن کے خلاف ہو اور خواہ اس طرز عمل پر دوسرے لوگ کتنی ملامت اور کتنا استہزاء کرتے ہوں ایک مسلمان کے پاس ان اوچھے اعتراضات کا جواب صرف یہ ہے کہ:

اللہ یستھزئ بھم و یمدھم فی طغیانھم یعمھون

اللہ ان کا استہزاء کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی میں ڈھیل دیتا ہے جس میں وہ سرگرداں پھرتے ہیں۔

ہاں یہ طرز عمل زندگی کے ان معاملات کے لئے ہے جنہیں قرآن و سنت نے فرض، واجب، مسنون، مستحب یا حرام اور مکروہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ یہ احکام ہر دور میں ناقابل تغیر ہیں، البتہ جو چیزیں مباحات کے ذیل میں آتی ہیں ان میں انسان کو اختیار دیا گیا ہے

کہ وہ وقت اور زمانے کی مصلحتوں کے لحاظ سے انہیں اختیار یا ترک کرنے کا فیصلہ کر سکتا ہے اور دیکھا جائے تو زندگی کے ایسے مسائل تعداد میں بہت کم ہیں جن کے بارے میں نصوص شریعت نے فرض و واجب، مسنون و مستحب یا حرام و مکروہ ہونے کی صراحت کی ہے اور جو ناقابل تغیر ہیں اس کے برعکس زندگی کی بیشتر چیزیں "مباحات" میں داخل ہیں، اور ان کے ترک و اختیار کے فیصلے ہر وقت بدلے جا سکتے ہیں۔

لہٰذا اسلام نے "جدت پسندی" کو جو میدان عطا کیا ہے وہ ایک وسیع میدان ہے جس میں وہ اپنی پوری جولانیاں دکھا سکتی ہے اور اس میں انسان اپنی عقل سے کام لے کر علم و انکشاف اور سائنس و ٹیکنالوجی کے بام عروج تک بھی پہنچ سکتا ہے اور ان معلومات کو انسانیت کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بھی بنا سکتا ہے۔

لہٰذا اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ "جدت پسندی" کی ان حدود کو پہچانے اور اسلام نے "جدت پسندی" کا جو وسیع دائرہ انسان کو دیا ہے، اسے چھوڑ کر اس مختصر دائرے میں دخل اندازی نہ کرے جس کے احکام شریعت نے خود مقرر کر دیئے ہیں، اور جو ناقابل تغیر ہیں اس کے برعکس عالم اسلام کا موجودہ طرز عمل یہ ہے کہ جس دائرے میں اسے جدید طرز فکر اختیار کرنا تھا، وہاں تو اس کی تگ و تاز انتہائی سست اور محدود ہے، اس کے برعکس جو احکام الٰہی ناقابل تغیر تھے، مسلمانوں نے اپنی "جدت پسندی" کا رخ ان کی طرف کر رکھا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عصر حاضر نے جو اچھائیاں انسانیت کو دی ہیں ان سے تو ہم محروم ہیں، اور جو برائیاں اس نے پیدا کی ہیں وہ سب تیز رفتاری سے ہمارے معاشرے میں سرایت کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم عصر حاضر میں اپنی ذمہ داریوں سے سلامت فکر کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اسلام اور صنعتی انقلاب

یوں تو زندگی ہر دم "رواں، پیہم دواں" ہے، ہر نیا زمانہ اپنے ساتھ نئے حالات اور نئے مسائل لے کر آتا ہے، لیکن خاص طور سے مشین کی ایجاد کے بعد دنیا میں جو عظیم انقلاب رونما ہوا ہے، اس سے زندگی کا کوئی گوشہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس انقلاب نے ہر علم و فن میں تحقیق و نظر کے نئے میدان کھولے ہیں، اور زندگی کے ہر شعبہ میں کچھ نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کی اصل تعلیمات پر نظر ڈالئے تو ان میں اس عظیم انقلاب کو اپنے میں جذب کر لینے کی کوئی صلاحیت آپ کو دکھائی نہیں دے گی، ان تعلیمات کا اصل سرچشمہ وحی خداوندی کے بجائے بشری ذہن تھا، اس لئے نہ تو اس میں انسانی فطرت کا پورا لحاظ تھا، نہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کی کماحقہ رعایت تھی، اور نہ مستقبل کے امکانات پر نگاہیں تھیں، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان مذاہب کی بیشتر اصلی تعلیمات آج مشین کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ چکی ہیں۔ ان مذاہب کے ماننے والوں کے سامنے اب دو ہی راستے رہ گئے ہیں، اگر وہ زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے مذہب کو خیرباد کہنا پڑتا ہے اور اگر مذہب زیادہ عزیز ہے تو ان کے لئے فکر و شعور کی ہر روشنی سے منہ موڑ کر یہ سمجھنا لازمی ہے کہ وہ بیسویں صدی کے انسان نہیں ہیں، البتہ کچھ ہوشیار ذہنوں نے ایک درمیانی راہ یہ نکالی ہے کہ اپنے مذہب میں بڑی محنت کے ساتھ کتربیونت شروع کر دی ہے اور اسے چیر پھاڑ کر اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ موجودہ زمانے کے لئے قابل عمل بن جائے۔ لیکن درحقیقت اس عمل جراحی کے بعد اس مذہب کو ان کا اصل مذہب سمجھنا دل کو بہلانے کا ایک خیال ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان کا اصل مذہب مٹ چکا ہے اب ان کے پاس اس نام کے ظاہری ڈھانچے کے سوا کچھ نہیں جس میں ایک نئے مذہب کی روح بھری ہوئی

لیکن اسلام کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس دنیا میں تنہا وہ ایک ایسا دین ہے جس کی تعلیمات سدا بہار ہیں، زمانے میں کیسے ہی انقلاب رونما ہو جائیں۔ حالات کتنے ہی بدلتے جائیں وہ پرانا نہیں ہوتا۔ وہ آج بھی تازہ ہے، اور جب تک یہ دنیا کروٹیں بدلتی رہے گی، وہ تازہ رہے گا، اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ اس کے اصول و ضوابط کسی بشری ذہن نے مرتب نہیں کئے، جو آنے والے حالات سے بے خبر ہو، اس کی تعلیمات کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے۔ جس ذات نے اسے انسان کا نظام حیات قرار دیا ہے وہی انسان کی اور اس تمام کائنات کی خالق ہے۔ اسے انسان کی فطرت کا پورا علم ہے وہ اس کی ضرورتوں کو خوب جانتی ہے۔ وہ تمام بدلتے ہوئے حالات سے پوری طرح باخبر ہے، اور اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ کب کیا ہونے والا ہے؟

یہ اسی کے کلام کا اعجاز ہے کہ اس نے اسلام کے جو اصول و قواعد قرآن کریم میں بیان فرمائے۔ اور جن کی تعلیم اس کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کی، وہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام مسائل پر حاوی ہیں، یہ دنیا لاکھ کروٹیں بدل لے۔ ان تعلیمات کو بدلنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آ سکتی، اسلام کے اصول و قواعد ہر دور اور ہر زمانے میں انسانیت کی رہنمائی کرنے کے لئے بالکل کافی ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ عالم اسلام کا ایک طبقہ جسے اہل تجدد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہا ہے اس لئے اس نے دوسرے مذاہب کی دیکھا دیکھی اسلام میں بھی ترمیم و تحریف کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے، اور صنعتی انقلاب کے ہر غلط یا صحیح مظہر کو اسلام کے مطابق ثابت کرنا اس نے اپنا فریضہ منصبی سمجھ رکھا ہے۔ یہ طبقہ اپنی ہر ترمیم و تحریف کے لئے سب سے بڑی دلیل یہ پیش کیا کرتا ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد سے دنیا یکسر بدل گئی ہے، اور حالات میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اس لئے لازماً اسلام کے احکام کو بھی بدلنا چاہئے ــــــ!

اس سلسلہ میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ یورپ کے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں زندگی کے ہر گوشے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، وہ دو قسم کی ہیں ایک تبدیلیاں تو وہ ہیں جو موجودہ ترقیات کے لئے ناگزیر اور ضروری تھیں۔ اور ان کے بغیر سائنس اور ٹکنالوجی کا موجودہ معیار تک پہنچنا ممکن نہ تھا، انہی کی بدولت دنیا نئی نئی ایجادات سے آشنا ہوئی۔ بڑے بڑے کارخانے بنے۔ پل تعمیر ہوئے، بند باندھے گئے، اور انسانی معلومات میں مفید اضافے ہوئے۔ صنعتی انقلاب کا پہلا

یہ پہلو بلا شبہ قابل تعریف ہے، عالم اسلام کے لئے اس میدان میں آگے بڑھنا ضروری ہے۔ اور اسلام نہ صرف یہ کہ اس راہ میں کوئی رکاوٹ عائد نہیں کرتا، بلکہ اس "اعداد قوت" کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ تبدیلیاں وہ ہیں جو صنعتی اور مادی ترقیات کے لئے ہرگز ضروری نہیں تھیں، مغرب نے انہیں خواہ مخواہ صنعتی انقلاب کے سر منڈھ دیا تھا، چنانچہ آج وہ بھی اپنی اس خامکاری پر لوٹے پڑھ رہا ہے۔ فحاشی و عریانی، مخلوط اجتماعات، رقص و موسیقی، سود اور ضبط ولادت وغیرہ یہ تمام وہ چیزیں ہیں جن کا مادی و صنعتی ترقیات سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ بلکہ تجربے نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ یہ چیزیں ترقیات کی راہ میں رکاوٹ تو بنی ہیں، مگر انہوں نے اس کام میں کوئی مدد بھی نہیں پہنچائی۔

یہی وہ چیز ہے جس سے عالم اسلام کو پوری احتیاط کے ساتھ بچنا ہے، عالم اسلام میں صنعتی انقلاب ضرور آنا چاہئے، لیکن ایسا صنعتی انقلاب جو مغربی تہذیب کی ان لعنتوں سے محفوظ و پاک ہو جنہوں نے مغرب کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے، افسوس ہے کہ ہمارا تجدد پسند طبقہ یہ چاہتا ہے کہ ہم مغرب کے صنعتی انقلاب کو بِلا بدلے بغیر جوں کا توں قبول کر لیں، اور جب ہمارے معاشرے میں مشین کا عمل دخل ہو تو اس کے ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے، ہم ان تمام فکری اور عملی گمراہیوں میں سرتاپا ڈوب چکے ہوں، یہی وجہ ہے کہ وہ سائنس اور ٹکنالوجی کو ترقی دینے سے زیادہ اپنی توانائیاں اس پر صرف کر رہا ہے کہ کسی طرح اسلام کو کھینچ تان کر مغربی تہذیب کے مطابق بنا دیا جائے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کا ترجمان ماہنامہ فکر و نظر اپنے طرز عمل کی دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

> "چوتھے پنج سالہ منصوبے کی تکمیل پر پاکستان کی پوری زندگی بدلی ہوئی ہوگی، یہاں مشین کا دور دورہ ہو گا، اور اس کی وجہ سے خانگی زندگی بدلے گی، معیشت اور معاشرت بدلے گی، عورت اور مرد کے تعلقات میں تبدیلیاں آئیں گی، اور ظاہر ہے اس سے انفرادی و قومی ذہن بھی متاثر ہو گا، اور لوگ اور ڈھنگ سے سوچیں گے۔"

(فکر و نظر ص ۳۳ ج ۴ شمارہ ۱۲)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات عالم اسلام کے صنعتی انقلاب اور مغرب کے صنعتی انقلاب میں کوئی فرق نہیں دیکھنا چاہتے، ہماری گذارش یہی ہے کہ ہمارے معاشرے میں

"مشین کا دور دورہ" کوئی بری بات نہیں۔ لیکن "اس کی وجہ سے" خاندانی زندگی، معیشت اور معاشرت، عورت اور مرد کے تعلقات اور لوگوں کے طرز فکر میں جن "تبدیلیوں" کی نشان دہی آپ فرمارہے ہیں، انھیں ہم عالم اسلام کے لئے زہر سمجھتے ہیں۔ یہ "تبدیلیاں" اسلامی مزاج سے میل کھانے والی نہیں ہیں، اور خود مغرب کے صنعتی انقلاب کا مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ اگر ہم مشین کے عمل دخل کے باوجود پرسکون زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان "تبدیلیوں" سے پرہیز کرنا ہوگا۔

اقبال مرحوم نے مغرب کے حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد کہا تھا کہ ؎

افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش

اور ؎

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ انھیں "مشینوں" اور "آلات" سے کوئی چڑ تھی اور وہ ٹکنالوجی کی ترقیات کے مخالف تھے بلکہ درحقیقت ان کا مقصد یہ تھا کہ مغرب نے مشین کے ساتھ جن آفتوں کو اپنے اوپر خواہ مخواہ مسلط کر لیا ہے وہ قابل نفرت اور لائق احتراز ہیں۔

لہٰذا موجودہ حالات میں ہمارے لئے صحیح راہ عمل یہی ہے کہ ہم صنعتی انقلاب کے شوق میں آنکھیں بند کر کے ان راستوں پر نہ چلیں جنہوں نے مغرب کو تباہی کے غار تک پہنچا دیا ہے۔ بلکہ پوری بصیرت اور بیدار مغزی کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کو اس طرح جذب کریں کہ اس سے ہماری ملی اقدار مجروح نہ ہوں۔ صنعتی انقلاب اپنے جلو میں جو نئے مسائل لے کر آئے گا اسلام میں ان کا وہ حل موجود ہے جو مغربی تہذیب کی خامیوں سے محفوظ اور پاک ہے۔ محققین اسلام کو یہی حل ان اصولوں کے مطابق تلاش کرنا ہے جو استنباط احکام کے لئے سلام نے مقرر کئے ہیں۔

اس کے برخلاف اگر اسلام کو کھینچ تان کر مغربی تہذیب کے مقتضیات پر فٹ کرنے کے لئے خود اسلام میں ترمیم و تحریف کی گئی اور اس کے بعد اس کو جوں توں کر کے عصر حاضر کی ضروریات کے مطابق بنا دیا گیا، تو آپ ہی بتلائیے کہ اس میں "اسلام" کا کیا کمال ہوا؟ اس طرح توڑ مروڑ کر ہر مذہب کو عصر حاضر کے مطابق بنایا جا سکتا ہے اور بہت سے مذاہب کے

"فنکاروں" نے بنایا ہے۔ ہماری نظر میں اس طرح کسی مذہب کو عصر حاضر کے مطابق بنا دینا ان "فنکاروں" کا کمال ہو تو ہو، اس مذہب کا کمال ہرگز نہیں ہے۔ ہم پوری دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کو دوسرے مذاہب پر قیاس کر کے اس کے ساتھ ایسا سلوک کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے، اور اس قسم کی ہر کوشش "تحریف دین" اور مستحق مذمت ہے۔

بلاشبہ اسلام کے بہت سے احکام و مسائل میں یہ لچک موجود ہے کہ زمانے اور حالات کے تغیر سے وہ بھی تغیر پذیر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس تغیر کے کچھ اصول ہیں، اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام کے ہر حکم کو اس قرار پر ڈھال دیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن وسنت اور اجماع امت کے جو احکام منصوص اور متعین ہیں وہ ناقابل تغیر ہیں، اور انہیں کسی زمانے میں بھی بدلا نہیں جاسکتا۔ البتہ جن معاملات پر زمانے کی تبدیلی کا اثر پڑ سکتا ہے، ان میں خود قرآن وسنت نے متعین احکام دینے کے بجائے کچھ اصول بتا دیئے ہیں جن کی روشنی میں ہر زمانے میں احکام مستنبط کر لئے جائیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر قرآن وسنت کا منشاء یہ ہوتا کہ ہر زمانے کے مسلمان اپنے حالات کے مطابق اور سابقہ امت کے اجماعی فیصلوں کے خلاف خود احکام وضع کر کے انہیں "اسلامی احکام" قرار دے سکتے ہیں تو قرآن وسنت کو زندگی کے ہر گوشے میں اس قدر تفصیلی احکام دینے کی کیا ضرورت تھی؟ بس اتنا کہہ دیا جاتا کہ ہر زمانے میں اپنے حالات کے پیش نظر قوانین بنا لیا کرو۔ اس کے برخلاف قرآن، سنت اور اجماع امت کے جو احکام متعین طور سے بتا دیئے ہیں ان کا واضح مطلب ہی یہ ہے کہ وہ قیامت تک کے لئے ہیں اور کسی زمانے میں انہیں تبدیل نہ کیا جا سکے گا۔ لہٰذا زمانے کی تبدیلی کا بہانہ لے کر ان احکام کو ہرگز نہیں بدلا جا سکتا اور یہ تا قیام قیامت تک کے لئے نہ صرف واجب العمل ہیں، بلکہ انہی میں مسلمانوں کی مادی ترقی کا راز بھی مضمر ہے۔

ہاں جن احکام کو خود قرآن وسنت نے زمانے کے حوالے کر دیا ہے، وہ بلاشبہ قابل تغیر ہیں۔ اور ہر زمانے کے حالات کے پیش نظر ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے اور کی جاتی رہی ہے۔ لیکن ہمارے تجدد پسند حضرات اس زمانے کی تبدیلی کی آڑ لے کر نہ صرف ان اجماعی احکام کو بدلنا چاہتے ہیں جو چودہ سو سال سے مسلسل چلے آ رہے ہیں۔ بلکہ وہ بہت سے عقائد میں بھی ایسی ترمیمات کرنا چاہتے ہیں جو قرآن وسنت کی واضح نصوص کے خلاف ہیں، اور جنہیں آج تک

امت کے کسی ایک قابل ذکر فرد نے بھی تسلیم نہیں کیا۔

اگر ان کی یہ ترمیمات حق بجانب ہیں تو پھر تو اس معاملے پر بھی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جس دین کے بنیادی عقائد تک کو چودہ سو سال کی مدت میں کوئی شخص صحیح طریقے سے نہ سمجھ سکا ہو تو کیا وہ دین اس لائق ہے کہ کوئی معقول آدمی اسے حق سمجھ کر اس کی پیروی کرے؟

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے تجدد پسند حضرات کو زمانہ صرف اس موقع پر بدلا نظر آتا ہے جب اس تبدیلی سے کوئی اباحت نکلتا یا مغرب کے کسی نظریے کو اسلام کے مطابق بہت کرنا پیش نظر ہو۔ اور جہاں زمانے کی تبدیلی کا نتیجہ کسی مشقت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہو وہاں زمانے کی تبدیلی کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ یہ بات تو اہل تجدد کی طرف سے بہت سنی گئی کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ اس لئے سود کو حلال ہونا چاہئے۔ لیکن آج تک ہم نے کسی بھی تجدد پسند کی زبان سے یہ کبھی نہ سنا کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ اس لئے نماز میں قصر کی اجازت اب ختم ہو جانی چاہئے اور یہ اجازت اس وقت کے ساتھ مخصوص تھی جب سفر میں بے انتہا مشقت اٹھانی پڑتی تھی۔ لہٰذا جو لوگ ہوائی جہازوں اور ایئر کنڈیشنڈ کاروں میں سفر کرتے ہیں ان کے لئے روزہ چھوڑنے اور نماز کو مختصر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

طرز عمل کے اس تفاوت سے آپ تجدد کی اباحیت پسندانہ ذہنیت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ درحقیقت اس کی تمام تر دلیلیں اپنے پہلے سے قائم کئے ہوئے نظریات کے لئے باقاعدہ بنائی جاتی ہیں۔ پیش نظر چونکہ یہ ہے کہ مغرب کے نظریات کو اسلام میں داخل کیا جائے۔ لہٰذا جس جگہ یہ مقصد پورا ہوتا ہے وہاں ہر گری پڑی بات دلیل بن جاتی ہے، اور جس جگہ وہی دلیل اپنے مقاصد کے خلاف پڑتی ہو، وہ قابل التفات نہیں رہتی۔ کاش! کہ ہمارے تجدد پسند حضرات ان گزارشات پر سنجیدگی کے ساتھ اور حقیقت پسندی کے ساتھ غور فرما سکیں، اور ان کی فکری صلاحیتیں "تحریف و ترمیم" کے بجائے کسی تعمیری خدمت میں صرف ہونے لگیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

وقت کے تقاضے

"علماء کو وقت کے تقاضوں کے ساتھ چلنا چاہئے۔" یہ وہ نعرہ ہے جو ہم اور آپ تقریباً ہر روز کسی نئے اسلوب کے ساتھ سن لیتے ہیں، ہمارے بہت سے قومی رہنما اس جملے کو بار بار دہراتے ہیں، اور اب تو ہماری اعلیٰ سطحی محفلوں میں جب کبھی کوئی دینی بحث آتی ہے تو اس جملے کی صدائے بازگشت ضرور سنائی دیتی ہے، ہمارے ملک کا ایک طبقہ جو جدت پسندی کی آڑ میں اسلام کے متفقہ اصول و احکام پر تنقید کرنے میں مصروف ہے، علماء حق کو اپنی راہ کا سب سے بڑا سنگ گراں سمجھتا ہے، وہ اپنی سب سے بڑی کامیابی اس میں سمجھتا ہے کہ علماء کو جس رخ اور جس تدبیر سے ہو سکے متہم اور بدنام کیا جائے، اسی لئے اس نے "تقاضائے وقت" کے مبہم جملے کو جدید ذہنوں کے مسحور کرنے کا اچھا طلسم سمجھ کر اختیار کیا ہے، اور اسی کا سہارا لے کر وہ قوم اور اصحاب اقتدار سے آئے دن یہ اپیلیں کرتا رہتا ہے کہ علماء ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، اس لئے وہ قابل گردن زدنی ہیں، اور ان کی کوئی بات قابل التفات نہیں۔

ان لوگوں کا معاملہ تو ہم اللہ پر چھوڑتے ہیں، جس سے کسی دل کا کوئی بھید پوشیدہ نہیں، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں پورے خلوص، دیانت اور سنجیدگی کے ساتھ علماء پر یہ بدگمانی ہے کہ وہ عہد حاضر کے تقاضوں سے بے خبر ہیں، اور اسی بے خبری کے نتیجے میں ہر نئی چیز کی مخالفت کرتے ہیں، آج کی محفل میں ہم ایسے ہی حضرات سے کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس گفتگو سے پہلے ہماری گزارش یہ ہے کہ اگر وہ واقعۃً سچے دل سے اسلام اور مسلمانوں کے بہی خواہ ہیں تو اس معاملے پر نہایت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کریں، اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے ذہن کو محض جذباتی نعروں کی گرفت سے آزاد کر کے یہ سوچنے کی کوشش فرمائیں کہ "وقت کے تقاضوں" کا کیا مطلب ہے؟ انہیں پورا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اور اس سلسلے میں علماء پر جو الزامات عائد کئے جا رہے ہیں واقعات کی دنیا میں ان کی کیا حقیقت ہے؟

سب سے پہلے متعین کرنے کی بات یہ ہے کہ "وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے" کا مطلب کیا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ دن رات وقت کے تقاضوں کی اہمیت کا درس دینے میں مصروف ہیں، خود ان کے ذہن میں ان تقاضوں کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ یہ مبہم نعرے لگاتے آئے ہیں کہ علماء وقت کے تقاضوں کے مخالف ہیں، لیکن انہوں نے کبھی یہ واضح نہیں کیا کہ آخر وہ کون سے تقاضے ہیں، جن کی مخالفت پر علماء نے کمر باندھ رکھی ہے؟ اگر وقت کے تقاضوں کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ممالک سائنس اور ٹکنالوجی کے ان تمام وسائل سے آراستہ ہونے کی کوشش کریں جن کے بغیر موجودہ دنیا میں آزادی کا سانس لینا ممکن نہیں رہا، تو بلاشبہ یہ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ لیکن خدا کے لئے کوئی ہمیں یہ بتلائے کہ وہ کون سا عالم دین ہے جس نے وقت کے اس تقاضے کو ناجائز بتلایا ہے؟ کس عالم نے کب یہ فتویٰ دیا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی کی کوشش حرام، ناجائز، لغو یا بیکار ہے؟ ماضی قریب میں سائنس نے کیسی کیسی حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں، خود ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نت نئی ایجادات کے کتنے انبار لگ گئے ہیں، ان میں سے کتنی ایجادات ہیں جن کی علماء کی طرف سے مخالفت کی گئی ہو؟ بجلی، تار، ٹیلیفون، ٹیلی پرنٹر، وائرلیس، ریڈیو، ٹرانزسٹر، ٹیپ ریکارڈر، کاریں، موٹریں، ہوائی اور دخانی جہاز، ریل گاڑیاں، حربی سامان میں: ٹینک، توپیں، انواع و اقسام کے بم، لڑاکا طیارے، آبدوز کشتیاں، راکٹ، میزائل، ریڈار، صنعت میں طرح طرح کی مشینیں اور کارخانے، زراعت میں ٹریکٹر، کیمیاوی کھاد، جراثیم کش دوائیں، طب میں جراحت کے ترقی یافتہ آلات، تشخیص کے لئے ایکسرے اور اسکرین کی مشینیں، علم و ہنر میں صنعت و تجارت، سائنس، حساب، ریاضی، جغرافیہ، فلکیات، معاشیات، سیاسیات کے ترقی یافتہ علوم و فنون، ان میں سے کون سی چیز ہے جس کی علماء نے مخالفت کی ہو، یا اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی ہوں؟

خود ہمارے ترقی پذیر ملک کی بیس سالہ تاریخ ہمارے سامنے ہے، اس عرصے میں علماء حق اور تمام دینی و مذہبی طبقات کی خواہشات کے عین مطابق ہمارا ملک بحمد اللہ مادی اور معاشی ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے، کتنے عظیم معاشی منصوبے اس عرصے میں

تکمیل تک پہنچے، بڑے بڑے کارخانے بنے، وسیع و عریض سڑکیں تعمیر ہوئیں، آب پاشی کے لئے کتنی نہریں نکالی گئیں، دریاؤں پر بڑے بڑے بند باندھے گئے، مواصلات کا فرسودہ نظام رفتہ رفتہ بدلا گیا، مختلف علوم و فنون کے کالج اور یونیورسٹیاں وجود میں آئیں، بے شمار بنجر علاقوں کو زیر کاشت لایا گیا ___ آخر کون شخص ہے، کون انسان ہے جو ان ترقیات سے ناخوش ہو؟ خدا کے لئے کسی ایک عالم دین کا نام بتائیے جس نے یہ کہا ہو کہ ملکی ترقی کے یہ راستے اختیار نہ کرو، اپنے ملک میں ماہر سائنس دانوں کو پیدا نہ کرو، لوگوں کو انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم نہ دلواؤ، کارخانے نہ بناؤ، سڑکیں، پل، نہریں اور بند تعمیر نہ کرو، ملک کے دفاع کے لئے ترقی یافتہ اسلحہ تیار کرنے کی کوشش نہ کرو، فوجوں کو جدید مشینی جنگ کی اعلیٰ تربیت نہ دو، مواصلات کے ترقی یافتہ ذرائع اختیار مت کرو، یا نئے علوم و فنون کی تعلیم و تربیت بند کر دو؟

اگر یہ باتیں کسی عالم دین نے نہیں کہیں ___ اور ظاہر ہے کہ کون کہہ سکتا ہے؟ ___ تو پھر علمائے حق پر اس بے سروپا بہتان کی بغض و عداوت کے سوا اور کیا تاویل کی جا سکتی ہے؟ ہمیں تو بحمد اللہ! علمائے حق کے حلقے میں ایسے بے شمار علماء معلوم ہیں جن کی امنگوں اور آرزوؤں کا مرکز پاکستان ہے، اور ان کے دل کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ اسلام کے صراط مستقیم پر گامزن ہونے کے ساتھ ساتھ مادی اعتبار سے بھی دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے، یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات علماء ایک طرف تو مسلمانوں کو یہ تاکید کرتے آئے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ماہرانہ تحصیل ہمارے فرائض کا ایک اہم جز ہے، اور اگر ہم نے اپنے اس فریضے میں کوتاہی کی تو ہم خدا کے حضور مجرم ہوں گے، دوسری طرف ان کی شب و روز دعائیں اسی کام کے لئے وقف ہیں جس کو صرف علیم و خبیر جانتا ہے۔

تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں، ہم اس وقت زمانہ حال ہی کے ان چند علماء کی تحریروں کے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں جن پر سائنس اور ٹیکنالوجی کی مخالفت کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔

پاکستان میں ملت علماء کے سرخیل شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ تھے، تعمیر پاکستان کے لئے ان کی بے لوث قربانیاں ناقابل فراموش ہیں، انہوں نے فروری ۱۹۴۹ء میں ڈھاکہ کی ایک کانفرنس میں پاکستانی علماء کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں فرمایا تھا کہ:

"خواہ ارباب اقتدار ہمارے ساتھ کچھ ہی برتاؤ کریں ہم خاص خدا کی

خوشنودی اور اسلام اور اہل اسلام کی برتری اور بہتری کے لئے اپنی اس نئی مملکت کو مضبوط و محفوظ بنانے میں امکانی کوشش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے"۔

(خطبہ صدارت جمعیۃ علماء اسلام کانفرنس
ڈھاکہ ۱۰ فروری ۱۹۴۹ء ص ۶ مطبوعہ کراچی)

آگے اسی تقریر میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ہم کو اپنی استطاعت و امکان کی آخری حد تک ان مادی ذرائع و وسائل کی فراہمی میں کمی اور سستی نہیں کرنی چاہئے جن سے ہم اپنے دشمنوں کے حوصلے پست کر سکیں، اور ان پر اپنی دھاک بٹھا سکیں، کیوں کہ یہ چیز خود قرآن کریم کے صریح حکم واعدوا لہم ما استطعتم الخ کے ذیل میں شامل ہے۔"
(ایضاً ص ۲۳، ۲۴)

نیز ارشاد فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک تو ہمارے سارے فوز و فلاح کا راز ان چار لفظوں میں مضمر ہے: صبر و استقامت، تقویٰ و طہارت، اتحاد ملت، اعداد قوت حسب استطاعت، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے اپنا تعلق صحیح رکھا جائے، تاکہ اس کی امداد و نصرت کے مستحق ہو سکیں۔ اور ساری ملت اسلامیہ متحد و یکجان ہو کر اپنی قدرت کی آخری حد تک وہ قوت فراہم کرے جس سے اجنبی لشکروں کے حوصلے پست ہو جائیں۔"

اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب صدر دارالعلوم کراچی اپنے رسالہ "جہاد" میں تحریر فرماتے ہیں:

"صبر و تقویٰ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان و توکل تو مسلمانوں کی اصل اور ناقابل تسخیر طاقت ہے ہی، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر زمانے اور ہر مقام کے مناسب اسلحہ اور سامان جنگ بھی جمع کیا جائے ..... رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ جنگی مشقوں کا اہتمام فرمایا، اس زمانے میں جنگ کے جو ہتھیار تھے انکو جمع کرنے کی ہدایتیں فرمائیں، امام حدیث و تفسیر ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخی کتاب البدایہ والنہایہ میں غزوہ حنین کے تحت نقل کیا ہے کہ رسول

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو صحابی حضرت عروہ بن مسعودؓ اور غیلان بن اسلمؓ اس جہاد میں اس لئے شرکت نہیں کر سکے کہ وہ بعض جنگی اسلحہ اور سامانوں کی صنعت سیکھنے کے لئے دمشق کے مشہور صنعتی شہر میں اس لئے گئے تھے کہ وہاں دبابہ اور ضبور کی وہ جنگی گاڑیاں بنائی جاتی تھیں۔ جن سے اس وقت ٹینکوں جیسا کام لیا جاتا تھا۔ اسی طرح منجنیق کی صنعت بھی وہاں موجود تھی۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ملک کو جنگی اسلحہ اور سامان کے لئے خود کفیل بنائیں، دوسروں کے محتاج نہ رہیں۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ جنگی گاڑیاں اور منجنیق وہاں سے خرید کر درآمد کر لی جاتیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر پورا غور کریں کہ ... ہم جیسے لوگوں کو اس کی ضرورت کس قدر زیادہ ہے، کہ موجودہ زمانے میں جنگ کے لئے جس طرح کے اسلحہ اور آلات اور سامان کی ضرورت ہے ان میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اور اس کوشش میں لگ جائیں کہ قریب سے قریب مدت میں ان چیزوں کے لئے اپنے ملک کو خود کفیل بنا سکیں۔" (جہاد، ص ۵۳ تا ۵۶، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۵ء)

نیز اپنی ایک اور کتاب "آلات جدیدہ" میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"خلاصہ کلام یہ ہے کہ مصنوعات وایجادات، قدیم ہوں یا جدید، جن سے انسان کی معاشی فلاح کا تعلق ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمتیں ہیں جو انسان کو عطا ہوئی ہیں عقل انسانی کا کام یہ ہے کہ ان نعمائے الٰہیہ سے فائدہ اٹھائے، اور اس کا شکر گزار ہو۔" (آلات جدیدہ، ص ۱۵ مطبوعہ کراچی ۱۳۸۱ھ)

اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی شیخ الحدیث دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"دشمن کے مقابلے کے لئے قوت حرب (جنگی طاقت) کو اس حد تک بڑھانا چاہئے کہ دشمن پر ہیبت چھا جائے... ہمارے پہلے خلفاء و سلاطین نے

فن پر پوری طرح حاوی تھے، حضرت معاویہؓ نے خلافت عثمانؓ میں پانچ سو بحری جہازوں کا جنگی بیڑہ تیار کر رکھا تھا، دشمن کی جنگی قوت کی مدافعت کا پورا سامان خود تیار کرتے تھے، دوسروں کے دست نگر نہ تھے، جیسے آج کل ہم دوسروں کے محتاج ہیں، سب مسلمان سربراہوں کو مل کر اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کرنے چاہئیں، اور نئی نئی ایجادیں بھی کرنی چاہئیں، یہ سب اعدوالہم ما استطعتم من قوۃ میں داخل ہیں۔" (ماہنامہ البلاغ جمادی الاولی ۱۳۸۷ھ ص ۳۳)

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی ماہنامہ "بینات" کے ایک قریبی اداریے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"عالم اسلام بالخصوص عرب کے صحراؤں میں قدرتی وسائل، تمام ذخائر، اور مال و دولت کی کمی نہیں، بلکہ فراوانی ہے، مگر یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ان کے مال و دولت کا بڑا حصہ یا تو غیر ملکی بینکوں میں جمع ہونے کی وجہ سے دشمنان اسلام کے کام آتا ہے، یا شاہ خرچی، عیش پرستی، عافیت کوشی اور آسائش پسندی کے لئے ضائع کیا جاتا ہے، لیکن فنی استحکام، عسکری تربیت اور اسلحہ سازی تقریباً صفر ہے، دشمنان اسلام جگہ جگہ ہوائی اڈے، بحری بیڑے، فوجی چھاؤنیاں اور اسلحہ سازی کے بڑے بڑے کارخانے قائم کر رہے ہیں، مگر عالم اسلام خدا فراموشی کے ساتھ ساتھ ظاہری تدبیر سے بھی محرومانہ غفلت میں مست ہے۔"

(ماہنامہ بینات کراچی، ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ ص ۴)

حضرت مولانا عبد الحق صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اپنی ایک تقریر میں اسی بات کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تم نے یورپ سے صرف بدعملی اور بدتہذیبی سیکھی، وہ تو ایک منٹ میں ایک جہاز بنائیں، بے شمار بم اور راکٹ بنائیں، یہود کے بچانے کے لئے اربوں روپے جمع کریں، اور ہم اپنی عرستیوں میں جلا رہیں، اجتماعی مقاصد کو بالکل بھول جائیں تو اس کا انجام ہلاکت کے سوا آخر کیا ہو گا؟" (ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک جولائی ۱۹۶۷ء ص ۱۷)

حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی اپنے ایک عالیہ مضمون "ترقی اور اسلام" میں اس موضوع پر فاضلانہ گفتگو کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"ترقی سے ہماری محرومی اور ہمارا یہ زوال ترک اسلام کا نتیجہ ہے، ورنہ اسلام اور ترقی تو لازم و ملزوم ہیں ... اس آیت کے مطابق تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ تمام جدید آلات میں اتنی ترقی کریں کہ اگر کسی اقوام سے سبقت نہ لے جاسکیں تو کم از کم ان کے مساوی ضرور ہوں، اور عالم اسلام اس کے لئے اپنی پوری قوت استعمال کرے۔ ("ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک ستمبر ۱۹۶۷ء، ص ۲۲)

طبقہ علماء کے چند جلیل القدر رہنماؤں کے یہ وہ ارشادات ہیں جو بغیر کسی خاص اہتمام کے اس وقت سرسری طور سے سامنے آگئے، ورنہ جو لوگ ان حضرات کی تحریریں پڑھتے رہتے ہیں ان پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ علماء نے نہ صرف یہ کہ کبھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی مخالفت نہیں کی، بلکہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کو اس کی ترغیب بھی دیتے رہے ہیں، اس کے باوجود ایک طبقہ ہے جو شب و روز یہ راگ الاپتا رہتا ہے کہ علماء ترقیات کے مخالف ہیں، انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی سے چڑ ہے، وہ وقت کے تقاضوں کو اہمیت نہیں دیتے، اور وہ ہر نئی چیز کے دشمن ہیں۔

جھوٹ کے سب سے زیادہ ہوشیار مبلغ گوبلز نے سچ کہا تھا کہ اگر جھوٹ کو شدت کے ساتھ پھیلایا جائے تو دنیا اسے سچ سمجھنے لگتی ہے، ہمارے "جدت پسند" حضرات گوبلز کے اس مقولے پر عمل کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ اب بہت سے اچھے خاصے پڑھے لکھے اور سنجیدہ لوگ بھی ان کے اس نعرے کو سچ سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ سفید جھوٹ ہے جس سے بڑھ کر شاید کوئی اور جھوٹ ماضی قریب میں پروپیگنڈا کی مشینریوں نے تیار نہ کیا ہو۔

ہاں اگر یہ حضرات رقص و موسیقی، فحاشی و عریانی، بے پردگی و آوارگی، مخلوط تعلیم اور زن و مرد کے آزادانہ اختلاط، سودی نظام بینکاری اور ضبط ولادت جیسی چیزوں کو وقت کے تقاضے اور ترقی کے اسباب سمجھتے ہیں، تو بلاشبہ علمائے حق نے ہمیشہ ان چیزوں کی کھل کر مخالفت کی ہے، انہیں کرنی ہی چاہئے تھی، اب بھی کرتے ہیں، اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے، لیکن خدا کے لئے ہمیں یہ بتلائیں کہ عقل و خرد کی کون سی منطق ان چیزوں کو وقت کا تقاضا اور ترقی کا سبب قرار دیتی ہے؟

جو حضرات ان چیزوں کو وقت کے تقاضے سمجھتے ہیں ہم انہیں چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کسی معقول دلیل کے ساتھ یہ بتلائیں کہ آخر رقص و موسیقی اور مادی ترقی میں کیا جوڑ ہے؟ فحاشی اور عریانی کے بغیر کون سی ترقی رک جاتی ہے؟ بے پردگی اور مخلوط تعلیم سے سائنس اور ٹیکنالوجی کو کیا مدد ملتی ہے؟ اور بنکاری کو غیر سودی نظام پر چلانے سے معاشی ترقی کی راہ میں کون سی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے؟ ا؎

آپ رقص و موسیقی، بے پردگی اور مخلوط مجالس جیسی چیزوں کو وقت کے تقاضے قرار دیتے ہیں، لیکن حالات کے پیش نظر ہمارا اعتقاد تو یہ ہے کہ آج وقت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی تقاضا نہیں ہے کہ عالم اسلام ان تمام چیزوں کا پوری جرات کے ساتھ قلع قمع کر ڈالے، اس لئے کہ ان چیزوں کی ہلاکت آفرینیاں جس قدر اس بیسویں صدی میں ظاہر ہوئی ہیں اتنی پہلے کبھی نہ ہوئی تھیں، خود وہ مغرب جس کی تقلید کے شوق میں آپ ان چیزوں کو وقت کے تقاضے سمجھ رہے ہیں آج اپنی اس خام کاری پر بری طرح مضطرب اور بے چین ہے۔ آج دنیا کا کوئی پڑھا لکھا انسان اس چیخ و پکار سے بے خبر نہیں ہو سکتا جو ان اشیاء کی تباہ کاریوں پر مغرب کے اہل فکر میں مچ رہی ہیں، پھر خدارا آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ وقت کا تقاضا کیا ہے؟ آیا یہ کہ عالم اسلام بھی مغرب کے ان نقوش قدم پر چلتا ہوا اخلاقی تباہی کے اسی مہیب غار میں جا گرے؟ یا یہ کہ مغرب کے اس ہولناک انجام سے سبق لے کر ہمیشہ کے لئے اس خطرناک راستے سے توبہ کرلے؟

مغربی تہذیب کی ان لعنتوں کو وقت کے تقاضے اور ترقی کے اسباب قرار دینے والا طبقہ اپنے آپ کو جدت پسند کہتا ہے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ فکر و عمل کے میدان میں وہ مغرب کے ان ہی فرسودہ نظریات کا پرچار کر رہا ہے جنھوں نے مغرب کو سلگتے ہوئے داغوں کے سوا کچھ نہیں دیا، جن لوگوں کی نظر جدید حالات پر ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنے ان پرانے نظریات کے بارے میں مغرب کا انداز فکر کتنی تیزی سے بدل رہا ہے؟ اور ان تمام موضوعات پر فلسفہ اور سائنس کی نئی تحقیقات کیا ثابت کر رہی ہیں؟ مثال کے طور پر ایک مسئلہ آبادی ہی کو لے لیجئے، جدید ماہرین معاشیات کی ایک بھاری تعداد تحدید نسل اور ضبط ولادت کی مخالف

ا؎ بینکوں کو غیر سودی بنیادوں پر کس طرح چلایا جائے؟ اس موضوع پر اہل علم کی طرف سے کافی مواد منظر عام پر آچکا ہے اور بینکاری کے ماہرین نے اسے نہ صرف قابل عمل بلکہ زیادہ مفید قرار دیا ہے۔

ہے۔ اور اس کے پاس دلائل کا جو تازہ ترین ذخیرہ ہے اس سے متاثر ہو کر ایسے ماہرین معاشیات کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے "جدت پسند" ہیں کہ ابھی تک مالتھس کے اس دقیانوسی نظریے کو سینے سے لگائے چلے جا رہے ہیں، جسے پھینک کر زمانہ دو سو برس آگے نکل چکا ہے۔

ہمارے جدت پسند طبقے رقص و موسیقی، بے پردگی، مخلوط تعلیم، اور مغربی طرز معاشرت جیسی چیزوں کو ترقی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ اور ملا کی تعلیمات کو تنزل کا، لیکن ذرا گوش ہوش کے ساتھ سنئے، علامہ اقبال کیا فرماتے ہیں۔

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب — نے ز رقص دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحران لالہ روست — نے ز عریاں ساق و نے از قطع موست
محکمی او را نہ از لادینی است — نے فروغش از خط لاطینی است
قوت افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است

حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانع علم و ہنر عمامہ نیست

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے جدت پسند حضرات، علماء پر وقت کے تقاضوں اور سائنس اور ٹکنالوجی کی مخالفت کا جو الزام عائد کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟

—— یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا "جدت پسند" طبقہ اس انتہائی غیر معقول بات کو اس قدر شد و مد کے ساتھ کیوں پھیلا رہا ہے؟ اس کی اصل وجہ تو خدا ہی کو معلوم ہوگی، جہاں تک ہم نے غور کیا اگر اس پروپیگنڈے کی پشت پر کچھ مخصوص مفادات نہیں تو درحقیقت اس کے پیچھے ایک نفسیاتی عامل کارفرما ہے، ہمارے جدت پسند طبقے کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام کو عیسائیت پر اور عالم اسلام کو مغرب پر قیاس کر رہا ہے۔ اس نے یہ دیکھا کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے وقت وہاں سائنس اور ٹکنالوجی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ عیسائیت اور اس کے علماء تھے، جب تک مغرب پر ان کی بالادستی پوری طرح قائم رہی مغرب کا پورا خطہ جہالت کی اندھیریوں میں بھٹکتا رہا۔ انہوں نے اپنی سیادت کے دور میں ہر اس تحریک کو زبردستی کچلنے کی کوشش کی جو عوام میں بھی بیداری پیدا کرنے کے لئے کھڑی ہوئی۔ جان ہس اور جیروم جیسے

لوگوں کو کانسٹنس کے شہر میں زندہ جلایا گیا، گلیلیو جیسے سائنس دانوں کو اس بناء پر مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ سائنس کے میدان میں نئی راہیں کھولنا چاہتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ بیداری کی یہ تحریکیں ہر طرف سے اٹھنی شروع ہوئیں، اور تشدد ان کی راہ نہ روک سکا، بالآخر مارٹن لوتھر، جان کالون اور زونگلی جیسے لوگوں نے ہمت کر کے پاپائیت کے اس سنگ گراں کو راستے سے ہٹایا اور ان تحریکوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے، پھر آخری دور میں روسو، پارنیک، اور رینان جیسے تجدد پسندوں نے مذہب میں مزید تبدیلیاں کر کے اسے عصر حاضر کی سائنٹفک تحقیقات کے بالکل مطابق بنا دیا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مغرب کے مذہب پسند طبقوں میں لوتھر، کالون، روسو اور پارنیک جیسے لوگوں کو مصلحین کا خطاب ملا ہوا ہے، انہیں قومی ہیرو تسلیم کیا جاتا ہے، اور نئی نسل کے جو لوگ مذہب سے بالکل ہی بیگانہ نہیں ہوئے انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ انہوں نے عیسائی مذہب میں بنیادی تبدیلیاں کر کے قوم کو اس پاپائی تسلط سے نجات دلائی جو ان کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

اب عالم اسلام کے تجدد پسند اسلام کو عیسائیت پر قیاس کر کے اس میں بھی اسی قسم کی ترمیمات کرنا چاہتے ہیں وہ اسلام کو عیسائیت کے، علمائے اسلام کو پوپ صاحبان کے، اور اپنے آپ کو لوتھر اور روسو کے قائم مقام سمجھتے ہیں، اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ علمائے اسلام کی مخالفت کر کے اس امت کے مصلح (REFORMERS) بننا چاہتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ عنقریب کوئی ہنری ہشتم اٹھے گا اور ان کے ان نظریات کو سرکاری طور پر سند قبول عطا کر کے ہمیشہ کے لئے نافذ کر دے گا، اور آنے والی نسلیں ان کی اس روش پر اسی طرح عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کریں گی جس طرح موجودہ مغربی نسل لوتھر، کالون، زونگلی، روسو، پارنیک اور رینان پر نچھاور کر رہی ہے۔

مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ انہیں بڑا ہی زبردست مغالطہ لگا ہے، اور ان کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہونے والا نہیں ہے، انہوں نے اسلام کو عیسائیت پر اور علماء کو پوپ صاحبان پر قیاس کر کے بڑی سخت غلطی کی ہے، عیسائی مذہب کا جو غیر فطری تصور تیسری صدی عیسوی کے بعد عام ہو گیا تھا، اس میں ہرگز اتنی سکت نہ تھی کہ وہ قیامت تک زمانے کا ساتھ دیتا رہے، اور زمانے کی تو بہ تو سائنٹفک تحقیقات سے آنکھیں ملا سکے۔ وہ جہالت اور توہم پرستی کی تاریکی تھی، جس کا علم کی روشنی کے سامنے ٹھہرنا ممکن ہی نہ تھا، اس لئے سائنس اس کے لئے ایک

زبردست خطرہ بن کر سامنے آئی۔ اب ان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ یا تو سائنس کی کھل کر مخالفت کریں، یا اپنے مذہب کو چیر پھاڑ کر اس قابل بنائیں کہ وہ سائنس کی جدید تحقیقات کا ساتھ دے سکے۔ ان کے پوپ صاحبان نے ابتداء میں پہلا راستہ اختیار کر کے سائنس کو شجرۂ ممنوعہ قرار دے دیا۔ لیکن سائنس اس زمانے کی حقیقی ضرورت تھی، اور محض بلا دلیل دعوے اس کا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔

اس مرحلے پر تجدد پسندوں نے دوسرا راستہ اختیار کر کے مذہب میں ترمیم و تغیر شروع کی، اور اسے کھینچ تان کر اس قابل بنا دیا کہ وہ کم از کم عہد جدید کے انسان کے سامنے ایک اچھوکہ نہ بن سکے۔ یہ بلاشبہ عیسائی مذہب پر ان کا ایک احسان تھا۔ اور اگر وہ یہ احسان نہ کرتے تو یہ مذہب عقلیت پسندی (RATIONALISM) کے سیلاب میں کبھی کا بہہ چکا ہوتا۔ اور آج اس کا نام و نشان بھی موجود نہ ہوتا۔ عیسائی تجدد پسندوں کی کاریگری سے عیسائی مذہب کو یہ فائدہ ہوا کہ اگرچہ اس کے بنیادی نظریات بالکل بدل گئے، لیکن کم از کم اس کا نام اور ظاہری ڈھانچہ آج بھی باقی ہے۔ عیسائیت پر تجدد پسندوں کا یہی وہ احسان ہے جس نے انہیں اپنی قوم کا ہیرو بنایا، اور جس کی وجہ سے بیشتر عیسائی دنیا انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

لیکن اسلام کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ دین فطرت ہے اور قیام قیامت تک زندہ رہنے کے لئے آیا ہے۔ اس میں اپنی قدیم اور اصلی تعبیرات کے باوصف ہر زمانے اور ہر دور کی تحقیقات کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی پوری صلاحیت ہے۔ اس لئے سائنس اس کے لئے نہ کبھی خطرہ بنی ہے نہ بنے گی۔ بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ سائنس کی نئی نئی تحقیقات عام طور سے اس کے معتقدات اور تعلیمات کو اور بے غبار کر دیتی ہیں۔ اس لئے نہ اسے سائنس کی مخالفت کرنے کی ضرورت ہے نہ اپنے آپ کو بدلنے کی۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے کبھی پوپ صاحبان کی طرح سائنس کی مخالفت نہیں کی۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ انسانی معلومات میں جتنا جتنا اضافہ ہو گا اسلام کے بیان کردہ حقائق اور نکھریں گے۔ اور چوں کہ امت اسلامیہ یقین رکھتی ہے کہ اسلام اللہ کا بنایا ہوا دین ہے اسے کسی زمانے میں بدلنے کی ضرورت نہیں، اس لئے اس نے ہمیشہ اس دین میں ترمیم و تحریف کی کوششوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو اسلام عیسائیت کی طرح بے جان مذہب ہے، جسے سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیات سے کچھ خطرہ ہو، نہ علمائے اسلام نے پوپ صاحبان کی طرح کبھی سائنس اور ٹکنالوجی کی مخالفت کی ہے، اور نہ اس دین کو اپنی بقاء کے لئے کسی مارٹن لوتھر یا روسو اور والٹیر کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ اس دین کی تاریخ میں جتنے لوگوں نے تجدد یا ترمیم و تحریف کی کوششیں کی ہیں انہیں مذمت اور ملامت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکا اس دین کی تاریخ میں تجدد اور ترمیم و تحریف کی تحریک اٹھانے والے لوتھر اور کالون نہیں کہلائے، ہماری تاریخ کے اہل تجدد کا نام مسیلمہ، عبداللہ بن سبا، ابو موسیٰ مزدار، حسن بن صباح، قرامطہ، ابوالفضل، فیضی اور ملا مبارک رہا ہے، جن میں سے بیشتر کی اولاد بھی اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرتے ہوئے شرماتی ہوگی، لوتھر اور کالون کی مخالفت کرنے والوں کا نام آج اکثر عیسائیوں میں بری طرح لیا جاتا ہے، لیکن تاریخ اسلام میں اہل تجدد کے مخالفین ابوبکر صدیق، علی ابن ابی طالب، احمد بن حنبل، محمود غزنوی اور مجدد الف ثانی اپنے ناموں سے آج بھی زندۂ جاوید ہیں، اور جب تک انسانیت کا ضمیر زندہ ہے ان مقدس ہستیوں پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرنے والے انشاء اللہ باقی رہیں گے۔ افسوس ہے کہ ہمارے موجودہ تجدد پسند حضرات اسلام اور عیسائیت کے اس عظیم فرق کو نہیں سمجھ پا رہے ہیں، اور اس غلط فہمی کے نتیجے میں علمائے اسلام کو برا بھلا کہنے، ان کی مخالفت کرنے، ان پر بہتان باندھنے اور الزامات عائد کرنے میں مصروف ہیں ــــ ہم پوری خیر خواہی اور دردمندی کے ساتھ ان سے یہ گذارش کرتے ہیں کہ وہ نہایت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اپنی اس روش پر نظر ثانی کریں، ورنہ جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ کسی طرح بھی اسلام اور مسلمانوں کے لئے ملک و ملت کے لئے اور خود ان کے لئے اچھا نہیں ہے۔ ؎

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بہ "ترکستان" است

کاش! کہ ہماری یہ گذارشات ان پر کوئی مفید اثر چھوڑ سکیں!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

یہ مضمون اگرچہ بظاہر "ادارۂ تحقیقات اسلامی" کو خطاب کر کے لکھا گیا تھا جس کے سربراہ اس وقت ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب تھے لیکن درحقیقت یہ تمام اہل تجدد سے خطاب ہے۔

تحقیق یا تحریف؟

بلاشبہ ہمارے زمانے میں ایسے بے شمار فقہی مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن کے حل کے لئے ضرورت ہے کہ علم دین میں تفقہ اور بصیرت رکھنے والے اہل تقویٰ علماء اجتماعی طور پر سوچ بچار کریں۔ اور ان میں سے بہت سے مسائل ایسے بھی ہیں جنہیں اسلام کے متفقہ اصولوں کی روشنی میں حل کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ علمائے دین اور مختلف جدید علوم کے ماہرین یکجا ہو کر بیٹھیں، اور متفقہ طور سے ان مشکلات کا حل تجویز کریں جو اس زمانے میں پورے عالم اسلام کو پیش آرہی ہیں۔

اس عظیم الشان کام کی ضرورت واہمیت علماء کے حلقوں میں عرصے سے محسوس کی جارہی ہے۔ اور اس مقصد کے لئے بعض مقامات پر کام بھی ہو رہا ہے، لیکن وسائل کی کمی کے باعث ابھی تک یہ کوششیں کوئی منظم اور اجتماعی رنگ اختیار نہیں کر سکیں۔

موجودہ حکومت نے برسر اقتدار آنے کے بعد اس اہم کام کے لئے ایک ادارہ قائم کیا۔ ہمارے موجودہ دستور کی دفعہ ۲۰۷ میں اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ اس ادارے کے ذریعے ایک طرف اسلامی مسائل کی تحقیق کی جائے۔ اور دوسری طرف معاشرے کو "صحیح اسلامی بنیادوں" پر استوار کیا جائے۔ خود صدر پاکستان جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب اپنی خود نوشت سوانح حیات میں تحریر فرماتے ہیں:-

"میں نے اسلامی نظریے کی ایک مشاورتی کونسل اور ایک اسلامی تحقیقاتی ادارہ تشکیل دیا ہے، جو ہمارے قانونی مسائل کا مذہب کی روشنی میں مطالعہ کر کے حکومت کو مشورے دے سکے، یہ طریقہ ہمارے قوانین کو اسلام کے رجحانات سے ہم آہنگ کرنے میں ہمارے قانون سازوں کی مدد کرے گا۔ لیکن ان قوانین کے قابل عمل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں آج کے معاشرے کی ضرورت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔"[1]

(فرنیڈیس ناٹ ماسٹرس، ص ۱۰۶، باب ہشتم)

اس مقصد کے مبارک اور اہم ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، یہ مقصد تو علماء اور ہر اسلامی ذہن رکھنے والے انسان کی آرزوؤں کے عین مطابق تھا۔ ملک کے مروجہ قوانین کے فرسودہ نظام کو بدل کر اسے اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا اہم کام اس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

لیکن کوئی ادارہ خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ اور کتنے ہی نیک مقصد کے لئے قائم کیا جائے، صرف اس وقت مفید نتائج پیدا کر سکتا ہے جب کہ اس کا طریق کار درست ہو، اس کے ارباب بست و کشا متعلقہ مسائل کو سلامت فکر کے ساتھ سوچنے کے اہل ہوں، ان کے ذہن میں کام کا ایک معقول اور مرتب نقشہ ہو، اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے انہوں نے جو راستہ اختیار کیا ہو وہ درست اور سیدھا ہو ـــــ جب تک یہ شرائط پوری طرح پائی نہ جائیں، کسی ادارے سے کامیابی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ "ادارۂ تحقیقات اسلامی" اب تک اپنے مقصد تاسیس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکا، اس کو قائم ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں، لیکن: صرف یہ کہ ابھی تک وہ کوئی مفید کام انجام نہیں دے سکا، بلکہ اس کی وجہ سے ملک میں انتشار اور خلفشار کی ایک افسوسناک فضا قائم ہو گئی ہے۔

اس بات کا اعتراف نہ کرنا حقیقت ناشناسی ہوگی کہ اب تک اس نے مسائل حل کرنے کے بجائے مسائل کھڑے کئے ہیں، معاشرے کی مشکلات دور کرنے کے بجائے مشکلات پیدا کی ہیں، فتنے دبانے کے بجائے فتنے جگائے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ جس ادارے کو قوم کی امنگوں اور آرزوؤں کا مرکز ہونا چاہئے تھا وہ ابھی تک قوم کا ذرہ برابر اعتماد حاصل نہ کر سکا۔ خوش فہمیوں کی جنت میں بسنا عقلمندی کا تقاضا نہیں ہے۔ پاکستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے دل ٹٹول کر دیکھئے، آپ کا ضمیر گواہی دے گا کہ یہ لوگ اس ادارے کو اپنا ادارہ نہیں سمجھتے، ان کے دلوں میں اس کے اب تک کے "کارنامے" کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں، اور اس پر بے اعتمادی کا عالم یہ ہے کہ اگر وہ کوئی صحیح بات بھی کہہ دے تو لوگوں کی نگاہ میں مشکوک ہو جاتی ہے۔

آج کی صحبت میں ہم مختصراً ان اسباب سے بحث کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے ایک انتہائی مفید ادارے کو انتہائی مضر اور ناکام بنا دیا ہے اور جن کی بناء پر ملک میں اتحاد و اتفاق کے

رشتے استوار ہونے کے بجائے اختلاف و انتشار اور نزاع و جدل کی ناخوشگوار فضا پیدا ہو رہی ہے۔

یہ معاملہ کسی ضد، ہٹ دھرمی، بات کی پچ یا کسی کے ذاتی وقار کا نہیں ہے، معاملہ قوم کے ایک ایسے اجتماعی مسئلے کا ہے، جس پر اس ملک میں اسلامی طرز فکر اور طرز زندگی کی بقاء موقوف ہے، اور اگر اسے پوری سنجیدگی اور سلامت فکر کے ساتھ حل نہ کیا گیا تو یہ قوم کبھی اس منزل مقصود کو نہ پا سکے گی، جس کے دل آویز تصور نے اس سے پاکستان بنوایا تھا۔ اس لئے وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ تمام متعلقہ افراد اس مسئلے پر نہایت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جذباتی نعروں سے بلند ہو کر غور و فکر کریں۔

ہمارے نزدیک اس ادارے کی ناکامی کا اہم ترین سبب یہ ہے کہ اس کے رجال کار موجودہ زندگی کے مسائل کا اسلامی حل تلاش کرتے وقت "تحقیق" اور "تحریف" کے درمیان فرق نہیں کر سکے، انہوں نے "تحقیق" کو "تحریف" کے ہم معنی قرار دے کر مسائل کے وہ سطحی حل تلاش کئے ہیں جو کسی طرح بھی اسلام کے مزاج سے میل کھانے والے نہیں ہیں۔

موجودہ زمانے کے اسلامی محققین کا فرض منصبی یہ تھا کہ وہ اس بات کی تحقیق کریں کہ بیسویں صدی کے انسان کو جو مسائل درپیش ہیں ان کے بارے میں اسلام کی اصل ہدایات کیا ہیں؟ انہیں کس طرح روبہ عمل لایا جا سکتا ہے؟ اور اگر اس راستے میں کچھ عملی دشواریاں ہیں تو انہیں کس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے؟ ان حضرات کا فرض یہ تھا کہ مغربی نظام زندگی کا تقلیدی ذہن کے بجائے تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے، اس میں جو چیزیں اسلام کے اصولوں سے متصادم نظر آتیں انہیں رد کر کے مسلمانوں کے لئے وہ متبادل راستے تجویز کرتے جو ایک طرف اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں، اور دوسری طرف ان میں عصر حاضر کی ضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔

لیکن ادارہ تحقیقات اسلامی کے محققین کا طرز عمل اس کے بالکل برخلاف ہے، انہوں نے ایک طرف تو یہ فرض کر لیا ہے کہ تیرہ سو برس پہلے کے اسلامی اصول و احکام (معاذ اللہ) اب فرسودہ ہو چکے ہیں، اور موجودہ دور میں ان پر عمل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان میں کچھ بنیادی تبدیلیاں نہ کر لی جائیں، (ان تبدیلیوں کو وہ "نئی تعبیریں" کہتے ہیں)۔

دوسری طرف ان کے ذہن میں یہ بات پوری طرح جم چکی ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کے تمام فکری اور عملی مظاہر سراسر خیر و برکت ہیں۔ اور جب تک مسلمان انہیں جوں کا توں قبول نہ کرلیں گے موجودہ زمانے میں ان کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔

بس ان ہی دو مفروضات کے تانے بانے سے تجدد کی ذہنیت تیار ہوتی ہے، اور اسی کے نتیجے میں ان کے کام کا انداز یہ رہا ہے کہ وہ مغرب کی طرف سے آئے ہوئے جس طرز فکر یا جس طرز عمل کو دیکھتے ہیں، پہلے اس کے بارے میں یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ سو فی صد درست ہے، اور موجودہ زمانے میں اسے اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں، پھر ان کی "تحقیق" کا سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ جس رخ اور جس تدبیر سے ہو سکے اسے اسلام کے مطابق ثابت کیا جائے۔ بلکہ اسلام کو اس کے مطابق بنایا جائے، خواہ اس کے لئے اسلام کے اجماعی مسلمات کو بدلنا پڑے، خواہ سنت اور حدیث کا انکار کرنا پڑے، اور خواہ قرآن کریم کی آیات میں کھینچ تان کرنے کے لئے نئی لغات تصنیف کرنی پڑے۔

ہمارے نزدیک یہی وہ طرز عمل ہے جس کے لئے "تحقیق" کے بجائے "تحریف" کا لفظ استعمال ہونا چاہئے۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے، اگر آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ اس کے اصول و احکام کسی انسانی ذہن کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ انہیں اس علام الغیوب نے مقرر کیا ہے، جو قیام قیامت تک کی ہر انسانی ضرورت سے پوری طرح باخبر ہے، اگر آپ کو اس بات پر بھروسہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام میں قیامت تک پیدا ہونے والے ہر مسئلے اور ہر مشکل کا اطمینان بخش حل موجود ہے، تو پھر آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بیسویں صدی کی مشکلات کا حل بھی ہمیں اسلام کے انہیں اصولوں میں ملے گا جو چودہ سو برس پہلے سرکار دو عالم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تھے، شرط یہ ہے کہ آپ اس احساس کمتری سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں، جس نے آپ کی نگاہ میں مغرب کو معیار حق بنا رکھا ہے، جب آپ ایک مرتبہ ہمت کر کے ذہن سے تقلید مغرب کے پردے اٹھا دیں گے تو آپ کو پوری خود اختیاری کے ساتھ مسائل کو سوچنے سمجھنے کا موقع ملے گا، پھر آپ کو موجودہ زمانے میں زندہ رہنے کے وہ راستے نظر آئیں گے جو مغرب کے بنائے راستوں سے الگ ہونے کے باوجود عصر حاضر کے تمام تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں گے، اور ان پر گامزن ہو کر آپ سکون اور قرار کی وہ دولت حاصل کر سکیں گے جو ابھی مغرب کے وہم و تصور میں بھی نہیں آئی۔

ہو سکتا ہے ہماری یہ بات آپ کو تلخ محسوس ہو، لیکن اگر آپ کی لغت میں "حقیقت پسندی" کا لفظ کوئی معنی رکھتا ہے تو سچے دل کو ٹٹول کر دیکھئے وہ گواہی دے گا کہ اب تک اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے وقت آپ کو یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں اہل مغرب ہمیں "رجعت پسندی" کا طعنہ نہ دے بیٹھیں، کہیں وہ ہمیں توہم پرست یا غیر مہذب نہ کہہ دیں۔ بس! یہی خوف ہے جو آپ کو اصل اسلامی ہدایات پر سنجیدگی سے غور نہیں کرنے دیتا، اور آپ صرف انہیں باتوں کو "اسلام" ثابت کرنے میں عافیت سمجھتے ہیں جنہیں مغرب کی طرف سے "روشن خیالی" کا خطاب ملا ہوا ہے۔

اس طریق کار کی بدولت ہو سکتا ہے کہ آپ کو اہل مغرب میں کچھ نیک نامی میسر آجائے۔ لیکن اس طریقے سے آپ کے مسائل کبھی حل نہیں ہو سکتے۔ نہ آپ اس طرح ایک زندہ اور آزاد قوم کے حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر آپ کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ غیروں کو خوش کر کے اپنوں سے بگاڑ لینا کون سی دانشمندی کا تقاضہ ہے؟ اکبر مرحوم کی یہ نصیحت آج بھی آپ کو دعوت فکر و عمل دیتی ہے کہ:

بے وفا کہہ دیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو!
دیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی!

ہم نے آپ کے طرز عمل کی جو تشریح کی ہے اگر اس میں آپ کو کوئی مبالغہ محسوس ہوتا ہے تو اپنے اب تک کے طرز عمل کا ایک حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر دیکھ لیجئے، ہماری اس بات کی تصدیق ہو جائے گی۔

آپ نے دیکھا کہ مغرب نے اپنی بنکاری کا سارا نظام "سود" پر قائم کیا ہوا ہے، اور اس نظام کو بھی تہذیب کی نمایاں خصوصیات میں سے شمار کیا جاتا ہے، بس! یہ دیکھ کر آپ نے اپنی تمام فکری تگ و دو اس بات پر صرف کر دی کہ کسی طرح تجارتی سود کو حلال قرار دیا جائے۔ آپ نے اس بات کی کبھی تحقیق نہ کی کہ بنکاری کے لئے سودی نظام ہی کیا ضروری ہے؟ اسے مضاربت کے اصولوں پر کیوں نہیں چلایا جا سکتا؟ آپ نے پوری امت اسلامیہ کی مخالفت مول لے کر سود مفرد اور سود مرکب کا فرق تو نکال لیا مگر مغرب کے سودی نظام کی مخالفت کر کے بلاسود بنکاری کے وہ اصول دریافت نہ کر سکے جن سے تقسیم دولت زیادہ ہموار اور زیادہ منصفانہ طریقے پر عمل میں آ سکتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ انشورنس کو مغرب میں تہذیب کی علامت سمجھا جاتا ہے، آپ نے اسے

جوں کا توں قبول کر لیا اور اسلام کو اس کے مطابق ثابت کرنے کے لئے قرآن و سنت میں تاویلات شروع کر دیں، لیکن آپ نے کبھی اس پہلو سے غور نہیں فرمایا کہ اگر انٹرسٹ کے مروجہ نظام میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے تو وہ نہ صرف اسلام کے اجتماعی اصولوں کے مطابق ہو سکتا ہے، بلکہ زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے ا ۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مغربی ممالک خاندانی منصوبہ بندی کی ترغیب دے رہے ہیں، آپ نے بھی اس کی تبلیغ شروع کر دی، اور قرآن و سنت کی جو نصوص اس کے خلاف دکھائی دیں اپنا سارا زور ان کی تاویلات پر خرچ کر دیا، لیکن کبھی آپ نے یہ نہ سوچا کہ چین اپنی ستر کروڑ آبادی کے ساتھ کس طرح زندہ ہے؟ ضبط ولادت پر عمل کئے بغیر اس نے مختصر سی مدت میں معاشی ترقی کی یہ منزلیں کس طرح طے کر لی ہیں؟ اور اب بھی بقول مسٹر چو این لائی - ہر نیا بچہ ان کے لئے مسرت کا پیغام کیوں لاتا ہے؟ آپ نے اہل مغرب کے شور و شغب میں نومولود بچے کے صرف ایک منہ کو دیکھا اور پھر پریشان ہو گئے کہ اس کے لئے غذا کہاں سے آئے گی؟ آپ نے اس کے دو ہاتھوں پر نظر نہ فرمائی جن کی اہمیت کے پیش نظر اسرائیل جیسا چھوٹا ملک مسلسل تکثیر آبادی پر عمل کر رہا ہے۔ اہل مغرب نے کہہ دیا تھا کہ کثرت آبادی ترقی پذیر ممالک کے لئے مضر ہے، آپ نے ان کے اس "مخلصانہ مشورے" کو قبول کر کے خاندانی منصوبہ بندی کو ضروری قرار دے دیا مگر کبھی اس پہلو سے غور نہ فرمایا کہ ویت نام نے امریکہ کا ناک میں دم کس طرح کر رکھا ہے؟ اور مغرب کو چین کے ڈراؤنے خواب کیوں نظر آتے ہیں؟ امریکیوں نے نعرہ لگایا تھا کہ ہم مشرق میں صرف ان ممالک کو امداد دیں گے جو ضبط ولادت پر کاربند ہوں۔ آپ نے سمجھا کہ یہ ہماری ہمدردی میں ایسا کہتے ہیں، لیکن کبھی آپ نے اس کی تحقیق نہ فرمائی کہ اسرائیل ضبط ولادت پر کاربند نہیں ہے، اس کے باوجود امریکہ اسے امداد کیوں دیتا رہا ہے؟

آپ نے سنا کہ تعدد ازدواج مغربی ممالک میں ممنوع ہے، اور ایک سے زیادہ شادیاں کرنا ان کی نگاہ میں عیب ہے، آپ نے اپنے دامن سے (معاذ اللہ) اس داغ کو دھونے کے لئے یہ معذرت پیش کر دی کہ ہمارے مذہب نے اسے صرف لمرجنسی کی مخصوص صورتوں میں جائز

ا۔ اس موضوع پر والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کے رسالے "بیمہ زندگی" کا مطالعہ مفید ہو گا۔ (م۔ ت۔ ع)

کیا تقاضا وہ جائز نہیں ہے، اس مقصد کے لئے قرآن کریم کی آیات کے اندر کھینچ تان کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، لیکن آپ نے کبھی اس بات کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں فرمائی کہ اہل مغرب کو کبھی بھی ایک سے زائد بیویوں کی ضرورت کیوں نہیں ہوتی؟ اور "نئی تہذیب" کی بدولت ہر ہوٹل، ہر نائٹ کلب، اور ہر پارک میں جس "تعدد ازواج" پر عمل کیا جاتا ہے اس کی موجودگی میں انہیں ضابطے کی دوسری شادی کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ـــــ اہل مغرب نے اس بات کی تشہیر کی تھی کہ تعدد ازواج کرنے والے بیویوں پر ظلم کرتے ہیں، آپ نے کہا کہ اس ظلم کو روکنا اسلام کا عین منشا ہے اس لئے آپ نے تعدد ازواج کو حرام قرار دے دیا، لیکن آپ نے یہ نہ سوچا کہ بے شمار افراد اپنی تنہا ایک بیوی پر ظلم کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے، بلکہ ایسے لوگوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے، لہٰذا اس طرز فکر کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک شادی کو بھی ممنوع قرار دیا جائے۔

آپ نے دیکھا کہ اہل مغرب پردے کو معیوب سمجھتے ہیں، چنانچہ آپ نے بے پردگی کے جواز کے لئے قرآن وسنت کے اجماعی احکام میں ردوبدل شروع کر دی، لیکن کبھی اس پہلو سے تحقیق نہ فرمائی کہ پردے کو چھوڑ کر اہل مغرب اخلاقی تباہی کے کس کنارے تک پہنچ گئے ہیں؟ اور اس معاملے میں مغرب کے سنجیدہ مفکرین کی واویلا کا سبب کیا ہے؟

آپ کو معلوم ہوا کہ مغرب میں مخلوط طریقہ تعلیم رائج ہے، آپ نے اسے بھی تہذیب کی علامت سمجھ کر اس کی تبلیغ شروع کر دی، لیکن کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی کہ کنسے [۱] رپورٹس (KINSEY REPORTS) نے امریکی معاشرے کی جو تصویر کھینچ کر دنیا کے سامنے رکھی ہے اس کے اسباب کیا ہیں؟ نہ آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا کہ ہمارے نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی اور مسلسل گرتے ہوئے معیار تعلیم کی ذمہ داری کن کن چیزوں پر عائد ہوتی ہے۔

آپ نے مطالعہ کیا کہ بہت سے اہل مغرب معجزات کو توہم پرستی قرار دیتے ہیں، چنانچہ آپ نے ان تمام معجزات کو بے اصل کہہ دیا جن کا مفصل ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، اور اس کے نتیجے میں پورے قرآن کو شاعرانہ تخیل قرار دے دیا، لیکن آپ نے کبھی یہ نہ سوچا کہ جن لوگوں

۱- امریکہ کے مشہور ماہر جنسیات پروفیسر الفریڈ کنسے جنہوں نے پندرہ سال کی طویل ریسرچ کے بعد شہرہ آفاق رپورٹ مرتب کی ہے، جو امریکی معاشرے کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان ہے۔

نے ابتداءً معجزات کا انکار کیا تھا وہ خدا کے وجود کو بھی (معاذ اللہ) توہم پرستی کی بدترین قسم کہا کرتے تھے۔ انہوں نے وحی اور رسالت کا بھی مذاق اڑایا تھا۔ دوسری طرف کبھی آپ نے اس طرف بھی توجہ نہیں کی کہ سائنس کی ترقی سے جو نت نئی تحقیقات سامنے آ رہی ہیں وہ کتنی تیزی سے معجزات کو انسانی ذہن سے قریب تر کر رہی ہیں۔

ان تمام حقائق کو ذہن میں رکھ کر خدا کے لئے بتایئے۔ ہماری اس بات میں کیا مبالغہ ہے کہ آپ مسائل پر غور و فکر کرتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ فی الواقع ان کا اسلامی اور عقلی حل کیا ہے؟ اس کے بجائے آپ کی نگاہیں مسلسل مغرب پر مرکوز رہتی ہیں۔ جس بات کی سند آپ کو وہاں سے مل جاتی ہے، آپ اپنی ساری توانائیاں اسے اسلام کے مطابق ثابت کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ خواہ اس کے لئے قرآن و سنت کے ساتھ کیسا ہی سلوک کیوں نہ کرنا پڑے، اور جس بات سے مغرب کی پیشانی پر بل پڑتے نظر آتے ہیں، آپ اپنا سارا زور اسے ممنوع اور ناجائز بتانے میں خرچ کر دیتے ہیں، خواہ اس کے لئے کتنی ہی واضح نصوص کو چھوڑنا پڑے۔

پھر اب تک آپ نے صرف ان مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے جو اہل مغرب کے اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور اپنے معاشرے کے بیشتر حقیقی مسائل جنہیں حل کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ ان کی طرف آپ نے کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ آپ نے اس ناانصافی کو تو دیکھا جو تعدد ازواج پر عمل کرنے والے اپنی بیویوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ حالانکہ تعدد ازواج کی بناء پر ہونے والے مظالم ہمارے معاشرے میں خال خال ہیں۔ اور دوسری قسم کے مظالم سے کوئی خاندان، کوئی محلہ اور کوئی بستی خالی نہیں۔ ہمارے معاشرے میں کئی عورتیں آپکو اکا دکا نظر آئیں گی جو سوکنوں کی وجہ سے مظالم کا شکار ہیں۔ لیکن ایسی بیویوں کی تعداد بے شمار ہے جن کی کوئی سوکن نہیں، مگر ان کی ازدواجی زندگی شوہر کی بدمزاجی کی وجہ سے جہنم بنی ہوئی ہے۔ ایسی عورتوں کی تکلیف نے آپ کے دل میں کوئی ٹیس پیدا نہ کی؟ ان کی بے بسی پر آپ کو کوئی رحم نہیں آیا؟ ان کو ظلم کے پنجے سے رہائی دلانے کے لئے آپ نے کوئی کوشش نہ فرمائی؟

شادی، بیاہ، جہیز، مہر، نان و نفقہ، منگنی اور سسرالی تعلقات سے متعلق جن جاہلانہ رسموں نے ہمارے معاشرے کو جکڑ رکھا ہے، ان کے خلاف آپ نے قلم کو کوئی جنبش دی؟ عدالتوں کے ناقص اور فرسودہ نظام نے جو حصول انصاف کو جوئے شیر لانے کے مترادف قرار

دے دیا ہے۔ اس کے بارے میں آپ نے کوئی تحریک نہ اٹھائی؟ شادی بیاہ کے معاملات میں بس آپ کو ایک ہی بڑی چیز دکھائی دی۔ اور وہ تھی "تعدد ازواج" جس پر عمل کرنے والے معاشرے میں مشکل سے دس فیصد تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنی تمام تر "تحقیقی صلاحیتیں" اسے ممنوع قرار دینے میں صرف کر دیں۔

خدارا غور فرمائیے اس "قل اوجمل پہاڑ" کا سبب اس کے سوا اور کیا ہے کہ تعدد ازواج کا مسئلہ مغرب نے پیدا کیا تھا۔ اس لئے وہ آپ کو سب سے زیادہ اہم نظر آیا۔ اور دوسرے تمام مسائل "دیسی" تھے۔ انہیں حل کرنے کی آپ کو کوئی جلدی نہ تھی۔

———

پھر جن مسائل کی طرف آپ نے توجہ فرمائی ہے ان کو حل کرنے کا انداز بھی آپ نے عجیب ہی اختیار فرمایا ہے۔ معاشرے میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ آپ ان کی تہہ تک پہنچ کر ان کے حقیقی اسباب تلاش کرتے، آپ نے ان کے ایسے سرسری اور آسان حل تجویز کئے ہیں۔ کہ بالفعل سر بگریباں ہو جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کے سبب عوام میں یہ جاہلانہ طرز عمل چل نکلا ہے کہ وہ بات بات پر اپنی بیویوں کو تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں۔ بلاشبہ یہ طرز عمل انتہائی غلط اور ناجائز ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کی اصلاح کے لئے ضرورت تھی، کہ اس بات کی خوب نشر و اشاعت کی جاتی کہ تین طلاقیں دینا شرعی طور پر کتنا بڑا گناہ ہے، نیز اس بات کی تحقیق کی جاتی کہ ایسے گناہ کا ارتکاب کرنے والے کے لئے کوئی تعزیر مقرر کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ —— اس کے بجائے آپ نے مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ تین طلاقوں کو تین شمار کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ مردوں کو کھلی چھٹی دے دی کہ وہ خواہ کتنی ہی طلاقیں دے ڈالیں یہ تسلیم ہی نہ کیا جائے گا کہ تین طلاقیں واقع ہوئی ہیں۔ کیا اس کی مثال بالکل ایسی نہیں ہے کہ آپ ایک مظلوم کو پٹتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور جب مظلوم آپ کو مدد کے لئے پکارتا ہے تو نہ آپ ظالم کے ہاتھ پکڑتے ہیں۔ نہ اسے ظلم پر کوئی تنبیہ کرتے ہیں۔ اس کے بجائے مظلوم سے یہ کہتے ہیں کہ تم مار کھاتے رہو۔ ہم تسلیم ہی نہ کریں گے کہ کسی نے تمہیں مارا ہے۔ خدا کے لئے سوچئے! کیا مظلوم سے ظلم اسی طرح دور کیا جاتا ہے؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بعض معاملات پر یتیم پوتا اپنے دادا کے مرنے کے بعد بے سہارا اور بے بس رہ جاتا ہے۔ آپ نے اس کی بے بسی کا یہ علاج کیا کہ اس کے چچاؤں کی میراث کا حصہ

کاٹ کرا دے دلوا دو، آپ کی نظر اس طرف نہ گئی کہ اگر یہ سلسلہ شروع کر دیا گیا تو یتیم بھتیجے اور یتیم بھانجے نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ اپنے چچا اور ماموں کی میراث سے محروم رہیں؟ نہ آپ نے اس بات پر غور فرمایا کہ ایک شخص کی بے بسی دور کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کی جیب پر زبردستی ڈاکہ ڈالا جائے۔ اس قسم کے بیکسوں کی امداد کے لئے اسلامی فقہ میں "کتاب النفقات" "کتاب الوصیۃ" اور "کتاب الزکوٰۃ" موجود ہیں، اگر ان احکام کو صحیح طور پر جاری و ساری کر دیا جائے تو ایسے بیکسوں کی امداد کہیں بہتر طریقے پر ممکن ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں پر جو شخص بھی سنجیدگی اور غیر جانب داری کے ساتھ غور کرے گا لازماً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ معاشرے کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ادارہ تحقیقات اسلامی اور اس کے ہم نوا اہل تجدد کا طرز فکر بنیادی طور پر ہی درست نہیں ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اب تک نہ صرف یہ کہ ملک و ملت کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکے، بلکہ انہوں نے ملک بھر میں انتشار، خلفشار، بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ کاش! کہ اس اہم ترین ادارے کے ارباب حل و عقد اس بات پر نیک نیتی کے ساتھ غور کر سکیں کہ جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ ملی اتحاد کے لئے کتنا مضر اور خطرناک ہے؟

ہم نے یہ گزارشات کسی گروہی تعصب کی بناء پر پیش نہیں کیں، یہ اس بات کا خیر خواہانہ اور دردمندانہ اظہار ہے جسے ہم سراً و علانیۃً حق سمجھتے ہیں اور جس پر سنجیدگی سے غور کرنا ملک کے ہر حساس مسلمان کا فرض ہے، ہم یہ گزارشات اس امید پر پیش کر رہے ہیں کہ ؎

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

اس کے بعد اہل تجدد کے طرز استدلال اور فکر و نظر سے متعلق کچھ اور بھی عرض کرنا ہے۔ وہ انشاءاللہ کسی آئندہ صحبت میں عرض کریں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اسلام کی نئی تعبیر

ہم نے گزشتہ مضمون میں تجدد کے مکتب فکر کا ایک پہلو نمایاں کیا تھا، اور وہ یہ کہ اس نے مغرب کے افکار و اعمال کو معیار حق کا درجہ دے رکھا ہے، اس کی ذہنیت، اس کی فکر، اس کے نظریات، اس کے دلائل تمام تر مغرب سے مستعار ہیں، جو حضرات تجدد کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں وہ اہل مغرب کی نگاہوں سے دیکھتے اور ان ہی کے دل و دماغ سے سوچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت اسلامیہ کا اجتماعی ضمیر ان کے نتائج فکر کو نہ قبول کر سکا ہے، نہ کر سکتا ہے۔

آج کی صحبت میں ہم ان حضرات کے طرز فکر اور طرز استدلال سے متعلق کچھ اور گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے موضوع کے سلسلے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، ہم اختصار کے ساتھ ان اسباب کی نشان دہی کریں گے، جن کی بناء پر ہمارے تجدد پسند حضرات کی کاوشیں تحقیق کے بجائے تحریف کی راہ پر پڑ گئی ہیں اور جن کی وجہ سے ان کے فکر و نظر کی "دیوار" مسلسل "کج" ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ایک ادنیٰ سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس حقیقت کو جانتا ہے کہ "تحقیق" کا مقصد "طلب حق" ہے اور ایک محقق کی حیثیت، ایک جج کی سی ہوتی ہے جس کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ پہلے سے کوئی متعین فیصلہ ذہن میں رکھے بغیر پوری غیر جانبداری کے ساتھ تمام متعلقہ معلومات کا جائزہ لے، مسئلے کے تمام ممکنہ گوشوں پر دیانت داری سے ساتھ غور کرے، اور جس جانب میں دلائل کا وزن زیادہ نظر آئے، اس جانب میں اپنا فیصلہ دیدے، اس کے برخلاف اگر کوئی شخص پہلے سے ایک فیصلہ اپنے ذہن میں جما لینے کے بعد اس فیصلے کے حق میں دلائل وشواہد تلاش کرے تو وہ ہرگز طالب حق نہیں ہے، اور نہ اس کی کاوشیں "تحقیق" کہلانے کی

مستحق ہیں۔

بالفاظ دیگر ایک محقق کا کام نظریہ قائم کر کے اس کے لئے دلیلیں ڈھونڈنا نہیں ہوتا، بلکہ دلیلیں دیکھ کر نظریہ قائم کرنا ہوتا ہے وہ دلائل کو اپنے فیصلے کی طرف کھینچ کر نہیں لاتا، بلکہ دلائل اسے کھینچ کر فیصلے کی طرف لے جاتے ہیں۔

مگر ہمارے اہل تجدد کا طرز عمل اس کے بالکل خلاف ہے۔ وہ فیصلے کو دلائل کے تابع بنانے کے بجائے دلائل کو فیصلے کے تابع بنانے کے قائل ہیں اور یہ ان کا صرف طرز عمل ہی نہیں ہے، بلکہ وہ اسی انداز تحقیق کو درست سمجھتے ہیں اور اسی کی تبلیغ کرتے ہیں، آپ نے ان کی تحریر و تقریر میں اس قسم کے جملے بارہا سنے ہوں گے کہ:۔

"ہم قرآن و سنت کی اس طرح تعبیر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے زمانہ کی ضروریات کے مطابق ہو۔"

اس جملے کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بات کی تحقیق نہیں کریں گے کہ عہد حاضر میں قرآن و سنت کے اصل احکام کیا ہیں؟" بلکہ پہلے از خود یہ متعین کر لیں گے کہ زمانے کی ضرورتیں کیا ہیں؟ پھر قرآن و سنت میں اس کے دلائل تلاش کریں گے اور اگر وہ نظر نہ آئے تو قرآنی آیات اور احادیث کی ایسی تعبیر (INTERPRETATION) کریں گے کہ وہ ہماری متعین کردہ ضروریات کے مطابق ہو جائے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان کے اس جملے میں اس بات کا کس قدر کھلا اعتراف موجود ہے کہ ہم اپنے فیصلوں کو قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے بجائے قرآن و سنت کو اپنے فیصلوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں! ہماری تحقیق کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن و سنت کے دلائل کے پیش نظر کوئی نظریہ قائم کریں، بلکہ ہماری کاوشوں کا منشاء یہ ہے کہ زمانے کی ضروریات کے بارے میں ہم نے جو نظریات قائم کر رکھے ہیں، انہیں ثابت کرنے کے لئے قرآن و سنت سے دلائل تلاش کریں اور انہیں کھینچ تان کر اپنے نظریات پر فٹ بٹھانے کی کوشش کریں۔

حالانکہ یہی وہ چیز ہے جسے "تحریف معنوی" کہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی معقولیت پسند انسان اہل تجدد کے اس طرز فکر اور طرز استدلال کی تائید نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر علم و تحقیق کی دنیا میں یہ الٹی گنگا بہنی شروع ہو جائے تو حق و صداقت کی آبرو بچانے کا کوئی طریقہ باقی نہیں رہتا۔ پھر تو ہر کمزور سے کمزور دعوے کو مدلل کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کی کوئی بات بھی بے دلیل باقی نہیں رہ

سکتی، اور انگریزی محاورے کے مطابق "ہر چیز کو ہر چیز سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔"

اس لئے کہ جب آپ ایک مرتبہ یہ طے کر چکے کہ فلاں بات ہمیں قرآن وسنت سے ثابت کرنی ہے، اور اس مقصد کے لئے آپ نے قرآن وسنت کی "نئی تعبیر" کرنے کا بھی تہیہ کر لیا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس بات کی تائید میں جو کمزور سے کمزور بات آپ کو نظر پڑے گی، اسے دلیل بنا کر آپ پیش کریں گے۔ اور اس کی مخالفت میں کوئی مضبوط سے مضبوط دلیل بھی آپ کے سامنے آ جائے تو اسے دریا برد کر دینے میں آپ کو کوئی دریغ نہیں ہو گا، اور جب بات اس مرحلہ پر پہنچ جائے تو پھر وہ کون سی چیز رہ جاتی ہے جسے قرآن وسنت سے ثابت نہ کیا جا سکے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ عیسائی مبلغین جو عالم اسلام میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں، سادہ لوح مسلمانوں کے سامنے ہمیشہ قرآن وحدیث ہی سے اپنے عقائد ثابت کیا کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دیکھو! قرآن میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "کلمۃ اللہ" کہا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی صفت کلام تھے، اور انجیل یوحنا بھی یہی کہتی ہے، قرآن ہی میں انہیں "روح اللہ" کہا گیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ خدا کی روح ہیں، اور خدا سے ان کا تعلق ایسا ہے جیسے جسم اور روح کا ہوتا ہے، اور پولس بھی یہی کہتا تھا۔ قرآن ہی نے یہ بھی کہا ہے کہ "ہم نے روح القدس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید کی تھی" اور اس سے مراد وہ واقعہ ہے جو انجیل متی میں بھی لکھا ہے کہ روح القدس حضرت
عیسیٰ پر کبوتر کی شکل میں نازل ہوئی تھی۔

لیجئے! خدا (۱)، کلمہ (۲) اور روح القدس تینوں اقنوم قرآن سے ثابت ہو گئے، اور قرآن جو تثلیث کے عقیدے کا کھلم کھلا مخالف ہے، اس "نئی تعبیر" کی بدولت خود اسی سے اس بے سروپا عقیدے کا ثبوت مل گیا۔ رہ گئیں قرآن کریم کی وہ آیات جن میں صراحۃً تثلیث کی نفی کی گئی ہے، سو جب تثلیث کا عقیدہ ثابت کرنا ہی ٹھہرا، تو کہا جا سکتا ہے کہ ان آیات میں حقیقی تثلیث کی نفی کی گئی ہے اور یہ بات عیسائی بھی مانتے ہیں کہ خدا تین نہیں، بلکہ یہ تین اقنوم در حقیقت ایک ہی ہیں۔ اور یہ جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ "جو لوگ مسیح ابن مریم کو اللہ کہتے ہیں وہ کافر ہیں" تو در حقیقت اس میں مونوفیسی فرقے کی تردید کی گئی ہے، اور جہاں جہاں قرآن نے نصرانیوں کو عذاب جہنم سے ڈرایا ہے اس سے مراد بھی کیتھولک فرقے ہیں۔

بلکہ مولوی عیسیٰ فرقے اس کے مخاطب ہیں، رہا قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ حضرت مسیحؑ کو سولی نہیں دی گئی۔ تو ٹھیک ہے! عام عیسائیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ مسیحؑ کے اقنوم کو سولی نہیں ہوئی۔ صرف پیٹری پیشین فرقہ "اقنوم مسیحؑ" کے سولی پر چڑھنے کا قائل تھا، اسی کی تردید قرآن نے کر دی۔ جہاں تک مسیحؑ کے جسد کا تعلق ہے تو قرآن نے اس کے پھانسی پر چڑھنے کی تردید نہیں کی۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا ___ "نئی تعبیر" ___ کا یہ کرشمہ کہ اس نے کس طرح تمام نصرانی عقائد قرآن سے ثابت کر دیئے؟ سوال یہ ہے کہ آپ کی "نئی تعبیر" میں اور عیسائیوں کی اس "نئی تعبیر" میں کیا فرق ہے؟! اگر آپ کو قرآن وسنت کی "نئی تعبیر" کر کے اسلام کے بنیادی احکام میں ترمیم کرنے کا حق حاصل ہے تو عیسائیوں کو یہ حق کیوں حاصل نہیں؟ آپ کس اصول، کس ضابطے اور کس قاعدے سے ان کی اس "نئی تعبیر" کو رد کر سکتے ہیں؟

یہاں شاید کسی صاحب کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم نے اہل تجدد کی "نئی تعبیر" کے لئے عیسائیوں کی نئی تعبیر" کی جو مثال پیش کی ہے۔ اس میں ہم نے کچھ مبالغہ سے کام لیا ہے لیکن خدا شاہد ہے کہ ہم نے یہ مثال پیش کرنے میں کوئی زیادتی نہیں کی، ہمارے تجدد پسند حضرات کے بیشتر دلائل ٹھیک اسی طرح کے ہوا کرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو ان حضرات کے مضامین پڑھ کر دیکھئے اس میں آپ کو بالکل ایسی ہی "نئی تعبیروں" کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔

ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے حال ہی میں "اسلام" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے، اس میں بھی بڑی دلچسپ "نئی تعبیریں" نظر آتی ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام میں بنیادی طور پر تین نمازیں فرض کی گئی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری سالوں میں دو نئی نمازوں کا اضافہ ہوا، اس لئے نمازوں کی تعداد میں بھی تبدیلی کا امکان ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"بہرحال یہ حقیقت کہ بنیادی طور پر نمازیں تین تھیں، اس کی شہادت اس واقعہ سے بھی ملتی ہے کہ ایک روایت ہے "پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بغیر کسی وجہ کے ان چار نمازوں کو دو نمازوں میں جمع کر دیا تھا۔" بہرحال یہ عہد نبوی کے بعد کے زمانے میں ہوا ہے کہ نمازوں کی تعداد، بغیر ان کی کسی قبا ل

تعداد کے، بڑی سختی سے پانچ متعین کر دی گئی، اور یہ حقیقت کہ بنیادی طور پر نمازیں تین ہیں، احادیث کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے نیچے، جو نمازوں کے پانچ ہونے کی تائید میں روایت کی گئیں، دب کر رہ گئی۔"

(ماہنامہ فکر و نظر ص۲۵۹ جلد ۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء)

ملاحظہ فرمائی آپ نے یہ "نئی تعبیر" ؟

ایک طرف تو اس "نئی تعبیر" کے نزدیک متواتر "احادیث کا وہ سیلاب" جھوٹا اور من گھڑت ہے جس میں ابتدائے اسلام سے نمازوں کی تعداد پانچ بیان کی گئی ہے، دوسری طرف وہ تنہا ایک روایت قطعی طور پر قابل اعتماد ہے "جس میں "جمع بین الصلوتین" کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے" پھر "جمع بین الصلوتین" والی روایت کا یہ جو مطلب بیان فرمایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار نمازوں کو دو بنا دیا تھا، وہ تو اس "نئی تعبیر" کا سب سے زیادہ دلچسپ کارنامہ ہے۔ اور اگر آپ نے "جمع بین الصلوتین" کی روایات پڑھی ہیں تو آپ اس کا "لطف" محسوس کر سکتے ہیں، (۱-) ای قسم کی دلیلوں کو دیکھ کر کسی نے کہا تھا کہ "تم ہر چیز کو ہر چیز سے ثابت کر سکتے ہو"۔

یہ تو ہم نے ایک مثال آپ کے سامنے پیش کی ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس "نئی تعبیر" کے "تیلوک" نے زمانے میں کوئی "صید" نہیں چھوڑا۔

اہل تجدد کی تفسیریں ملاحظہ فرمایئے، اس میں آپ کو "نئی تعبیر" کے کیسے کیسے "شاہکار" نظر آئیں گے۔ "وحی" ان حضرات کے نزدیک خود "رسول" کا کلام ہوتا ہے، اور فرشتوں سے مراد پانی، بجلی، وغیرہ، ابلیس سے مراد قوت واہمہ، جن سے مراد وحشی قبائل، انس سے مراد متمدن لوگ، موت سے مراد غشی، ذلت یا کفر، زندہ ہونے سے مراد عزت پانا، ہوش میں آنا یا اسلام لانا، اور پتھر پر لاٹھی مارنے سے مراد لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چڑھنا ہے۔

ان "نادر تفسیری نکات" کو ذہن میں رکھ کر غور فرمایئے کہ ہم نے ان کی جو مثال عیسائیوں کی تعبیرات سے پیش کی ہے۔ اس میں ہم نے کیا زیادتی کی ہے؟

خیر! یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ اگر دلائل کو نظریات کے تابع

(۱-) اصل حقیقت صرف اتنی ہے کہ کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظہر اور عصر کی نمازیں اس طرح پڑھتے تھے کہ ظہر کے بالکل آخر وقت میں ظہر ادا فرمائی اور اس کے فوراً بعد عصر کا وقت داخل ہوتے ہی عصر کی نماز، اسے "جمع بین الصلوتین" کہتے ہیں۔

پڑھنے کا طرزِ فکر اپنا لیا جائے تو قرآن ہی سے عیسائیت بھی ثابت ہو سکتی ہے، یہودیت بھی، اشتراکیت بھی اور سرمایہ داری بھی۔ آخر اسی طرزِ استدلال کو اپنا کر پرویز صاحب نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو قرآن سے ثابت کر دکھایا ہے اور قرآنی جملہ "اقیموا الصلوٰۃ (نماز قائم کرو) سے ان کے "قرآنی رسالہ" نے اشتراکی انداز کا ایک معاشی نظام مستنبط کر لیا ہے، یہی اندازِ فکر اختیار کر کے مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی نے دمشق سے قادیان مراد لے لیا ہے، اور یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام "باب لد" کے مقام پر دجال کو قتل فرمائیں گے تو اس سے مرزا جی نے اپنے مسیح موعود ہونے پر استدلال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "لد" سے مراد "لدھیانہ" ہے اور اس کا دروازہ قادیان ہے۔

غرض اہلِ تجدد نے جو تحقیق و استدلال کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ پہلے از خود کچھ نظریات متعین کر کے انہیں وقت کے تقاضے قرار دیدو اور پھر اپنی "نئی تعبیر" کے ذریعہ قرآن وسنت کو ان پر چسپاں کر کے رکھا دو، یہی وہ خشتِ اول ہے جس کی کجی نے ان کی فکر و نظر کی پوری عمارت ٹیڑھی کر دی ہے اور یہی وہ بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے ان کے افکار تحقیق و نظر کے تمام اصولوں، تمام ضابطوں اور تمام قاعدوں کو روندتے ہوئے "تحریف" کی سرحدوں میں داخل ہو گئے ہیں۔

دنیا کے ہر علم و فن میں تحقیق و نظر کے کچھ اصول اور ضابطے مقرر ہوتے ہیں، جس کی پابندی کئے بغیر اس فن کی تحقیق میں صحیح نتائج تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ موجودہ اصول قانون (JURISPRUDENCE) میں بھی "تعبیر قانون موضوعہ" (INTEPRETATION OF STATUTES) ایک مستقل علم ہے، جس کے باقاعدہ اصول و ضوابط ہیں، اور جب تک ان اصولوں کی پورے طور سے رعایت نہ کی گئی ہو، کسی شارحِ قانون کی کوئی تشریح قابلِ قبول نہیں ہو سکتی ہے۔

اسی طرح، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ معقول اور منظم طور پر فقہ اور "تعبیر قرآن وسنت" کے مفصل اور واضح اصول و ضوابط موجود ہیں، جو "علم اصول فقہ" میں انتہائی تحقیق و تدقیق، نکتہ رسی اور دیدہ ریزی کے ساتھ مدون کئے گئے ہیں۔ اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں موجود ہیں اور ان میں ایک ایک قاعدے کو خوب اچھی طرح نکھار دیا گیا ہے، جب تک قرآن وسنت کی تعبیر ان اصولوں اور ضابطوں کے مطابق نہیں ہوگی، اسے کوئی معقولیت پسند انسان قبول نہیں کر

سکتا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کسی موجودہ شدنی قانون کی وہ تشریح قبول نہیں کی جا سکتی جو "تعبیر قانون موضوعہ" کے اصولوں کے مطابق نہ ہو۔

مگر ہمارے اہل تجدد اپنے اس الٹے طرز فکر کی بناء پر اپنی تعبیرات اور تشریحات میں ان میں سے کسی اصول کے پابند نہیں ہوتے اور جا بجا تعبیر قرآن و سنت کے ان مسلّم قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہیں — مثلاً اصول فقہ کا ایک مسلّمہ قاعدہ ہے کہ قرآن و سنت کے کسی لفظ سے اس کے مجازی معنی صرف اس وقت مراد لئے جائیں گے جب حقیقی معنی مراد لینا یا ناممکن ہو، یا اس لفظ کے حقیقی معنی عرفاً متروک ہو گئے ہوں، اور جہاں یہ دونوں باتیں نہ ہوں، وہاں حقیقی معنی ہی مراد ہوں گے یہ ایک سو فیصد معقول اصول ہے جسے عقل و خرد کی کوئی دلیل چیلنج نہیں کر سکتی اور اگر اس قاعدہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو کسی شخص کی کسی بات سے کوئی یقینی مفہوم کبھی نہیں سمجھا جا سکتا۔

لیکن ہمارے تجدد پسند حضرات ہر ہر قدم پر اس اصول کی مخالفت کرتے ہیں، انہیں جہاں قرآن و سنت کا کوئی لفظ اپنے منشاء کے خلاف نظر آیا انہوں نے فوراً اسے اپنی مرضی کے مطابق مجازی معنی پہنا دیئے، جیسے کے لفظ سے پوتا مراد لے لیا۔ "انگلی" سے مراد "دلیل" لے لی۔ موت سے مراد "غفلت یا ذلت" لے لی، انگلیوں سے مراد "قوت و بازو" لے لی۔ یہاں تک کہ اللہ اور رسول سے مراد "مرکز ملت" لے لیا۔ (۱)

یہ تو ایک ادنیٰ سی مثال ہے، ورنہ اگر ان کی ایسی بے قاعدگیوں کو جمع کیا جائے تو بلا مبالغہ ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

پھر تھوڑی دیر کے لئے "اصول فقہ" کے ان مسلّم اور معقول قواعد سے بھی قطع نظر کر لیجئے جو فقہاء نے مدون فرمائے ہیں، لیکن آپ نے تعبیر قانون و سنت کے دوران کوئی اصول تو مد نظر رکھا ہوتا، اگر "اصول فقہ" کے قواعد و ضوابط آپ کو پسند نہ تھے تو دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہوتا کہ تعبیر قرآن و سنت کے یہ قواعد فلاں فلاں وجوہ سے غلط ہیں، پھر دلائل ہی کے ساتھ ان کے متبادل دوسرے قواعد مقرر کئے ہوتے، اس کے بعد آپ اپنی تحقیقات میں ان ہی قواعد کا لحاظ رکھ لیتے۔

---

(۱) قرآن کریم کے الفاظ کی یہ تشریح متعدد تجدد پسند مصنفین نے کی ہے، لیکن یہ سب مثالیں یکجا دیکھنی ہوں تو پرویز صاحب کی معارف القرآن ملاحظہ فرمایئے۔

مگر ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ آپ کی تعبیرات کے پیچھے کوئی اصول، کوئی ضابطہ اور کوئی قاعدہ ہی نہیں ہے، ایک مقام پر آپ ایک قاعدے کو توڑتے اور اس کی مخالفت کرتے ہیں، مگر جب کسی دوسرے مقام پر وہی قاعدہ آپ کو اپنا مؤید معلوم ہوتا ہے تو آپ اسے بے چون وچرا تسلیم فرما لیتے ہیں جب کوئی حدیث آپ کو اپنے متعین کردہ نظریئے کے خلاف نظر پڑتی ہے تو آپ اسے رد فرما دیتے ہیں۔ خواہ وہ اسناد کے لحاظ سے کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو، لیکن جہاں کسی حدیث سے اپنے نظریئے کی تائید ہوتی ہو، وہاں آپ اس کی وجہ سے قرآن کریم کی واضح آیات کو بھی چھوڑ دیتے ہیں خواہ وہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف اور غیر معتمد ہی کیوں نہ ہو، اگر علماء متقدمین کے اقوال آپ کے خلاف ہوتے ہیں تو آپ پوری امت کے اجماع کو بھی پس پشت ڈال دیتے ہیں، اور جس جگہ کسی عالم یا فقیہ کا کوئی قول مفید مطلب نظر آجاتا ہے، اسے بے چون وچرا تسلیم فرما لیتے ہیں، خواہ وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو؟

اس کی تازہ مثال ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کا وہ بیان ہے جس میں انھوں نے بسم اللہ کے بغیر ہی ذبیحہ کو حلال کہا ہے۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد یہ ہے: ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ اور اس (ذبیحہ) کو نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

لیکن چونکہ یہ بات ڈاکٹر صاحب کے نظریئے کے خلاف تھی، اس لئے انھوں نے اس موقع پر حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے استدلال فرمایا، اور ایک امام شافعیؒ کے قول سے جو ان کے سارے فقہی اقوال میں شاید سب سے زیادہ کمزور قول ہے (اور اس کی کمزوری کا اعتراف خود شافعی علماء نے بھی کیا ہے)

حالانکہ جہاں تک روایت حدیث کا تعلق ہے، اس کے بارے میں جناب ڈاکٹر صاحب نے اپنا مسلک یہ بیان فرمایا تھا کہ:

> "اگر ایک حدیث کوئی ایسی بات کہتی ہے جو قرآن کریم کی ظاہر تعلیم سے ہم آہنگ نہیں تو میں اس حدیث کو رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اسلامی تاریخ کے اس خاص دور کی طرف منسوب کروں گا۔"

(ماہنامہ فکر ونظر جلد ۲ شمارہ ۸ ص ۵۱۵)

قطع نظر اس سے کہ انھوں نے حضرت عائشہؓ کی حدیث سے بسم اللہ کے بغیر ذبیحے کی حلت پر جو استدلال کیا ہے، وہ کس قدر غلط ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جب آپ نے اپنا مسلک یہ بیان

فرما دیا کہ جو حدیث قرآن کریم کی ظاہر تعلیم سے ہم آہنگ نہ ہو، میں اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہی نہیں کروں گا تو اس حدیث پر آپ نے اعتماد کیسے فرما لیا جب کہ وہ قرآن کریم کی ظاہر تعلیم سے ہم آہنگ نہ تھی؟

رہ گئے امام شافعی رحمہ اللہ علیہ، سو ان کے بارے میں آپ کا ارشاد یہ تھا کہ:۔

"امام شافعیؒ کی روشن دماغی اور تیز طبعی نے ایک منطقی نظام تو پیدا کر دیا جس سے بلاشبہ ہمارے ازمنہ وسطیٰ والے معاشرتی مذہبی ڈھانچے میں استحکام بھی پیدا ہو گیا۔ لیکن مستقبل میں اس کی وجہ سے جدت فکر اور تخلیق سے محروم ہو جانا پڑا۔"

(ماہنامہ فکر و نظر جلد شمارہ ۱ ص ۳۰)

سوال یہ ہے کہ جو امام شافعیؒ ایسی زبردست "اصولی غلطی" کے مرتکب ہو سکتے ہیں، کیا کسی جزئی مسئلے میں ان کے اجتہاد کو بطور دلیل پیش کرنا آپ کے لئے جائز ہے؟

کیا اس جیسی مثالوں سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ ان حضرات کے ذہن میں تحقیق واستدلال کا کوئی سوچا سمجھا اصول ہی نہیں ہے، نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنی "نئی تعبیر" میں اصول فقہ کے تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا، بلکہ خود اپنے وضع کئے ہوئے اصولوں کی پابندی بھی ان حضرات سے نہیں ہوتی۔

ذرا غور فرمایئے، اس "اصولی گریزی" کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ یہ حضرات نظریہ پہلے قائم فرماتے ہیں اور دلیلیں بعد میں ڈھونڈتے ہیں، اور یہ طریق کار اصول وقواعد کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا، چنانچہ انہیں ہر نظریے کے لئے ایک الگ قاعدہ وضع کرنا پڑتا ہے۔

اب اگر کوئی شخص ان حضرات سے یہ گذارش کرتا ہے کہ خدا کے لئے "علم وتحقیق" کے حال پر رحم کھایئے اور قرآن وسنت کو اس طرح موم کی ناک نہ بنایئے جس طرح یہود ونصاریٰ نے تورات وانجیل کو بنا لیا تھا، تو ان حضرات کے نزدیک وہ شخص "رجعت پسند" ہے، قابل گردن زدنی ہے اور اسے "وقت کے تقاضوں کی خبر نہیں" اس کے بارے میں اہل تجدد کا فتویٰ یہ ہے کہ:۔

"وہ نئے دور کا انکار کرتے ہیں، اور اس کے تقاضوں سے بے خبر ہیں۔"

(فکر ونظر جلد ۲ شمارہ ۱۲ ص ۳۱ء)

ہمیں معلوم ہے کہ ہماری گزارشات کے جواب میں بھی ہمیں یہی "طعنہ" سننے کو ملے گا، لیکن ہم نے اس امید پر یہ گزارشات پیش کی ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی کریں گے، کہ شاید ہماری کوئی بات کسی دھڑکتے ہوئے دل کو متاثر کر دے۔ شاید کوئی ضمیر جاگ اٹھے، اور اتنا سوچ لے کہ "تحقیق" کے نام پر "قرآن و سنت" کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے؟

علماء اور پاپائیت

قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر اور روز مرہ پیش آنے والے نت نئے مسائل میں ان سے احکام مستنبط کرنا کس کا کام ہے؟ اور اس کام کے لئے کیا شرائط اور صفات (QUALIFICA TIONS) ضروری ہیں؟ اس سوال کا جواب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک صحیح روایت سے ملتا ہے جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا۔

قلت یا رسول اللہ ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر ولا نہی فما تامرنی؟ قال تشاوروا الفقہاء و العابدین ولا تمضوا فیہ رای خاصۃ رواہ الطبرانی فی الاوسط و رجالہ موثقون من اہل الصحیح (مجمع الزوائد ص ۱۷۸ ج ۱ المطبع الانصاری دھلی ۱۳۰۸ھ)

> میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہمارے درمیان کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جس کا بیان (قرآن و سنت میں) موجود نہ ہو، نہ کوئی امر، اور نہ کوئی نہی، تو ایسی صورت میں میرے لئے آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرو، اور اس معاملے میں انفرادی رائے کو ظاہر (جاری) نہ کرو۔"

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح الفاظ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ قرآن و سنت سے احکام مستنبط کرنے کے لئے دو شرائط کسی شخص میں پائی جانی ضروری ہیں۔ ایک اس کا "فقیہ" ہونا، دوسرے "عابد" ہونا پہلی شرط کی اہمیت تو بالکل ظاہر ہے۔ اس لئے کہ قرآن و سنت کی مراد وہی شخص سمجھ سکتا ہے۔ جو قرآن و سنت کا وسیع اور عمیق علم رکھتا ہو۔ احکام کے جو اصول ان میں بیان کئے گئے ہیں، ان سے پوری طرح باخبر ہو، اور جس

نے اپنی زندگی اس کام میں صرف کر کے دین و شریعت کا مزاج سمجھنے کی پوری کوشش کی ہو۔ اسی طرح اس کا "عابد" یعنی اسلامی احکام پر کاربند ہونا بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ جو شخص خود اپنی عملی زندگی میں حلال و حرام اور جائز ناجائز کی تمیز نہ کرتا ہو، اور جس کے شب و روز اسلامی احکام کے مخالف ہوں، وہ ہرگز دین کے مزاج کو نہیں اپنا سکتا۔ احکام مستنبط کرنے کا کام درحقیقت حق کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ اور قرآن کریم کی تصریح کے مطابق اللہ تعالیٰ حق شناسی کی صفت اس شخص کو عطا فرماتا ہے جو اپنی زندگی میں عملی طور پر حق کا احترام کرتا ہو۔

"ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا"

اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے تو وہ تمہیں (حق و باطل کی) تمیز عطا کر دے گا۔

اس آیت نے واضح طور پر بتلا دیا ہے کہ "تقویٰ" حق و باطل میں تمیز پیدا کرنے کی لازمی شرط ہے، اور اس کے بغیر یہ اصول ملکہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

غرض قرآن کریم کی اس آیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشاد نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بتلا دیا ہے کہ اسلامی معاشرے میں جو نت نئے مسائل پیش آ سکتے ہیں، ان کا دینی اور فقہی حل تلاش کرنے کا کام وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو ایک طرف "فقیہ" ہو، اور دوسری طرف "عابد" یا "متقی"۔

پچھلے دنوں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم صدر دارالعلوم کراچی نے اپنے ایک بیان میں اسی بات کو مختصر لفظوں میں اس طرح تعبیر فرمایا تھا کہ:

"جن مسائل کا صریح حکم کتاب و سنت میں مذکور نہیں، ان کے حل کا طریقہ اہل فتویٰ، اہل تقویٰ علماء کا باہمی مشورہ ہے، شخصی اور انفرادی رائے کا مسلمانوں پر مسلط کرنا جرم ہے"۔

لیکن نہ جانے کیوں ہمارے تجدد پسند طبقے کو یہ بات بہت کھلتی ہے، یہ حضرات قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر اور اس سے احکام مستنبط کرنے کے لئے نہ "عالم" اور "فقیہ" یا "اہل فتویٰ" ہونے کو ضروری سمجھتے ہیں، اور نہ "عابد" یا "اہل تقویٰ" ہونے کو، ان کی طرف سے عرصہ دراز سے یہ شور مچا ہوا ہے کہ:-

"قرآن و سنت کی تشریح پر علماء کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہئے ـــ
اسلام میں پاپائیت نہیں ہے، اس لئے کسی خاص گروہ کو قانون
سازی کا حق نہیں دیا جا سکتا ـ قرآن و سنت کی تشریح کا حق تمام
مسلمانوں کو ہے، صرف علماء کو نہیں" ـــ "علماء کو اسلام کے
معاملے میں ویٹو کا حق نہیں دیا جا سکتا" وغیرہ وغیرہ۔

یہ وہ چلے ہوئے نعرے ہیں جن سے تجدد پسند طبقے کی کوئی تحریر بمشکل خالی ہوتی ہے۔

جہاں تک اس معاملے میں قرآن و سنت کی ہدایات کا تعلق ہے، ہم انہیں اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ان میں تشریح دین کے لئے "علم" اور "تقویٰ" کی شرائط پر کتنا زور دیا گیا ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ ان غلط فہمیوں کی حقیقت بھی واضح کی جائے جو ان نعروں میں پنہاں ہیں، اور جن کا راگ ہمارے اہل تجدد صبح و شام الاپتے ہیں۔

ان کا پہلا نعرہ یہ ہے کہ:ـ "اسلام میں برہمنیت یا پاپائیت نہیں ہے، اس لئے علماء کے خاص گروہ کو قانون سازی کا حق نہیں دیا جا سکتا۔"

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ بات کہنے والے یا تو پاپائیت اور تھیوکریسی کے مفہوم اور اس کی اصل برائیوں سے ناواقف ہیں، یا جان بوجھ کر سادہ لوح عوام کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ جس شخص کے دل میں انصاف اور حقیقت پسندی کی ادنیٰ رمق موجود ہو وہ اس بات کو محسوس کر سکتا ہے کہ "علم" اور "فقہ" یا "تقویٰ" کسی نسل و رنگ یا کسی ذات پات کا نام نہیں ہے، جسے کوئی شخص اپنے اختیار سے حاصل نہ کر سکے۔ یہ ایک خاص کام کی صفاتِ اہلیت (ELIGIBILITY QUALIFICATIONS) کا نام ہے جن کو ہر شخص ہر وقت حاصل کر سکتا ہے، اگر کسی مخصوص کام کے لئے کچھ اہلیت کی صفات مقرر کرنا آپ کے نزدیک "پاپائیت" ہے تو زندگی کا کون سا شعبہ اس "پاپائیت" سے خالی ہے۔ ملک کی صدارت اور وزارت کے لئے جو علمی قابلیت اور جو اخلاقی کردار ضروری قرار دیا جاتا ہے، پھر تو وہ بھی آپ کے نزدیک "پاپائیت" ہو گا اور "جج" کے لئے علم قانون کی جو مہارت شرط قرار دی گئی ہے، اسے بھی "پاپائیت" کہنا پڑے گا۔

وکالت کا اہل بننے کے لئے کم از کم ایل ایل بی ہونے کو جو ضروری سمجھا گیا ہے، کہہ دیجئے کہ یہ بھی "پاپائیت" ہے۔ کسی یونیورسٹی میں پڑھانے کے لئے جو ڈگریاں لازمی قرار دی گئی ہیں، اس کے بارے میں بھی یہ فتویٰ صادر فرما دیجئے کہ اس میں "پاپائیت" کی روح کار فرما ہے۔ اور کسی الیکشن میں امیدواری کے لئے عمر، عقل اور اخلاقی کردار سے متعلق جو شرائط مقرر کی جاتی ہیں، ان پر بھی یہ اعتراض اٹھا دیجئے کہ ان پر "پاپائیت" کا سایہ پڑ گیا ہے۔

اگر ان تمام کاموں کے لئے اہلیت کی کچھ شرائط عائد کرنا "پاپائیت" نہیں ہے، تو "تشریح کتاب و سنت" کے لئے "علم" اور "تقویٰ" کی شرط لگانا آخر کون سی منطق کی رو سے "پاپائیت" میں داخل ہو سکتا ہے؟

جس شخص نے "پاپائیت" اور برہمنیت کے نظام کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا، وہ علماء اسلام اور پوپ یا برہمن صاحبان میں مندرجہ ذیل موٹے موٹے فرق محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

(۱) "برہمن" اور "پوپ" عملاً دونوں رنگ و نسل اور ذات پات کے ایک مخصوص طبقے کے نام ہیں۔ باہر کا کوئی شخص لاکھ کوشش اور ہزار صلاحیتوں کے باوجود اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پاپائیت کی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ڈاکوؤں اور قزاقوں کو "پوپ" بنا دیا گیا۔ اس کے برخلاف عالم وہ صفت ہے جسے حاصل کرنے کے لئے رنگ و نسل کی کوئی قید نہیں۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں علماء ہر رنگ اور ہر نسل میں ہوتے ہیں، یہاں تک کہ غلاموں میں بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے اور ملک و قوم کے پیشوا مانے گئے۔ اور ہمیشہ ان کی فضیلت کا سبب ان کا علم و تقویٰ رہا ہے، نہ کہ کوئی مخصوص خاندان۔

(۲) پوپ کو جس مذہب کی ترجمانی کا دعویٰ ہے، اس کی تعلیمات زندگی کے بیشتر اہم مسائل میں خاموش ہیں، اس لئے پوپ کی مرضی خدا کی مرضی ہو کر رہ گئی ہے۔ جس پر کوئی دوسرا اعتراض کی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شارح قانون نہیں، بلکہ ایک آزاد اور خود مختار واضع قانون ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف کتاب و سنت کے احکام ہمہ گیر اور اس کے اصول و ضوابط بعینہٖ محفوظ ہیں۔ کوئی عالم اگر ان اصول و ضوابط کے خلاف کوئی بات کہے تو دوسرے علماء اس کی لغزش پر گرفت کرنے کے لئے ہر وقت موجود رہے ہیں اور موجود ہیں۔

(۳) پاپائیت میں قانون سازی اور مذہب کی تشریح و تعبیر کا اختیار بالآخر فرد واحد پر جو کر ختم ہوتا ہے۔ تنہا اسی شخص کو "مسیح کی بھیڑوں کا گلہ بان" اور کلیسا کے موسس کا جانشین قرار دیا گیا ہے، اس کے برخلاف "علماء" کسی ایک فرد کا نام نہیں جو کسی تنظیم کا سربراہ ہو، بلکہ ہر وہ شخص جس نے صحیح اصولوں پر علم دین حاصل کیا ہو، عالم ہے اور وارث رسول ہے، اس لئے کوئی ایک عالم تنہا اپنی مرضی کو پوری امت پر مسلط کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔

پاپاؤں کی قانون سازی اور علماء کی تشریح کتاب و سنت میں اتنے عظیم الشان فرق کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص علمائے اسلام پر پاپائیت کا فقرہ چست کرے تو عقل و ہوش، حق و صداقت اور امانت و دیانت کا خدا ہی حافظ ہے۔

اسی پاپائیت والی بات کو اہل تجدد کی طرف سے ایک دوسرے پیرایہ میں یوں بھی تعبیر کیا جاتا ہے کہ "کتاب و سنت پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، اس لئے اس کی تعبیر و تشریح کا حق علماء کے لئے محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔"

پروپیگنڈہ کے مشاق ہیں کہ اس نعرے کو بے تکان دہراتے چلے جا رہے ہیں۔ مگر کوئی خدا کا بندہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ اس اعتراض کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے ایک شخص جس نے کبھی کسی میڈیکل کالج کی شکل تک نہ دیکھی ہو۔ یہ اعتراض کرنے لگے کہ ملک میں علاج و معالجہ پر سند یافتہ ڈاکٹروں کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی ہے؟ مجھے بھی بحیثیت ایک انسان کے یہ حق ملنا چاہئے۔ ــــ یا کوئی عقل سے کورا انسان یہ کہنے لگے کہ ملک میں نہریں، پل اور بند تعمیر کرنے کا ٹھیکہ صرف ماہر انجینئروں ہی کو کیوں دیا جاتا ہے؟ میں بھی بحیثیت ایک شہری کے یہ خدمت انجام دینے کا حق دار ہوں ـــــــ یا کوئی عقل سے معذور آدمی یہ اعتراض اٹھانے لگے کہ قانون ملک کی تشریح و تعبیر پر صرف ماہرین قانون ہی کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی ہے، میں بھی عاقل و بالغ ہونے کی حیثیت سے یہ کام کر سکتا ہوں۔

ہمیں توقع نہیں ہے کہ کوئی صحیح العقل انسان اس قسم کی باتیں کہہ سکتا ہے، اور اگر واقعۃً کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ اپنے دل میں یہ خلش رکھتا ہو تو کیا اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ بلاشبہ بحیثیت ایک شہری کے تمہیں ان تمام کاموں کا حق حاصل ہے، لیکن ان کاموں کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے سالہا سال دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے، ماہر اساتذہ سے ان

علوم و فنون کو سیکھنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے ڈگریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ پہلے یہ زحمت تو اٹھاؤ، پھر بلاشبہ تم بھی یہ خدمتیں انجام دے سکتے ہو۔

سوال یہ ہے کہ یہی بات اگر قرآن و سنت کی تشریح کے دقیق اور نازک کام کے لئے کہی جائے تو وہ "اجارہ داری" کیسے بن جاتی ہے؟ کیا قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کے لئے کوئی اہلیت اور کوئی قابلیت درکار نہیں؟ کیا اس کے لئے کسی درس گاہ میں پڑھنے اور کسی استاد سے علم حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں؟ کیا پوری دنیا میں ایک قرآن و سنت ہی کا علم ایسا لاوارث رہ گیا ہے کہ اس کے معاملے میں ہر شخص کو اپنی "تشریح و تعبیر" کرنے کا حق حاصل ہے، خواہ اس نے قرآن و سنت کا علم حاصل کرنے کے لئے چند مہینے بھی خرچ نہ کئے ہوں۔

ہمارے تجدد پسند حضرات علماء پر اس غیظ و غضب کا اظہار تو صبح و شام فرماتے ہیں کہ وہ تشریح قرآن و سنت کے اہل کیوں بن بیٹھے ہیں؟ لیکن انہوں نے کبھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی کہ علماء نے اس اہلیت کو حاصل کرنے کے لئے کتنے پاپڑ بیلے ہیں؟ کس طرح انگریزوں کے دو صد سالہ اقتدار میں ان کے ظلم و ستم کا ہدف بن کر، اور چوں کہ انگریز کی طرف سے ان پر وسائل معاش کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے تھے، اس لئے مال و دولت کی چمک دمک سے منہ موڑ کر، روکھی سوکھی کھا کر، موٹا جھوٹا پہن کر، اور اس کے باوجود آپ جیسے حضرات کے طعنے سن کر یہ علم حاصل کیا ہے؟ کس طرح سالہا سال چراغوں کے سامنے آنکھیں سلگائی ہیں؟ —— جان و مال اور جذبات کی کیسی کیسی قربانیاں دے کر دینی علوم کو زندہ رکھا ہے؟ اور کس طرح اپنی زندگی کو دین کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے؟ —— اس کے بعد اگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کتاب و سنت کی تشریح کا حق دیتے ہیں، اور پوری امت اسلامیہ ان کے اس حق پر اعتماد کرتی ہے تو آپ کو اس پر گلہ کیوں ہے؟

کتاب و سنت کی تشریح کے لئے آپ کا اشتیاق بلاشبہ قابل تعریف ہے، لیکن اس کے لئے جس دیدہ ریزی کی ضرورت ہے پہلے کچھ اس کا ذائقہ تو چکھئے، زندگی کا کچھ حصہ علوم کتاب و سنت کے کوچے میں گزاریئے۔ اس کوچے کے آداب سیکھئے، اس کے بعد اگر کوئی شخص آپ کے لئے کتاب و سنت کی تشریح کے حق کا قائل نہ ہو تو بلاشبہ آپ کا گلہ جائز اور برحق ہوگا۔

بحالات موجودہ تو آپ کا مسلک یہ ہے کہ:

جس کو جان و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں؟

اور اس کے نتیجے میں آپ کی جو کیفیت ہے اس کے لئے اکبر الہ آبادی مرحوم کا شعر پیش کرنے سے تو گستاخی ہو جائے گی اقبال کے الفاظ میں اس کی تصویر سن لیجئے۔

علم غیر آموختی، اندوختی
روئے خویش از غازہ اش افروختی
ارجمندی از شعارش می بری
من ندانم تو توئی یا دیگری؟
عقل تو زنجیری افکار غیر
در گلوئے تو نفس از تار غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار
در دل تو آرزو ہا مستعار
قمریانت را نوا ہا خواستہ
سرو ہایت را قبا ہا خواستہ
بادہ می گیری بجام از دیگران
جام ہم گیری بوام از دیگراں
آں نگاہش سر ما زاغ البصر
سوئے قوم خویش باز آید اگر
لست منی گویدت مولائے ما
وائے ما اے وائے ما اے وائے ما

ان حالات میں یہ قوم جسے مسلمان کہتے ہیں، اور جو ہزار عملی کوتاہیوں کے باوجود نظری طور پر آج بھی مسلمان ہے، قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کو آپ کے حوالے کیسے کر سکتی ہے؟

رہ گئی یہ بات جس کا اظہار ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کی طرف سے ماہنامہ فکر و نظر نے اس طرح کیا ہے کہ:۔

"اسلام میں امت من حیث المجموع (۲) قانون سازی کرتی رہی ہے

اور اب بھی اسی کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے۔"

تو کاش وہ اس کی بھی وضاحت فرما دیتے کہ کیا امت کے من حیث المجموع قانون سازی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ امت کے کروڑوں افراد میں سے ایک ایک فرد قانون سازی کرے، اور ہر ان پڑھ دیہاتی بھی اس کام میں شریک ہو؟ یا امت کو یہ حق حاصل ہونے کی معنیٰ یہ تھا کہ وہ اپنے میں سے کچھ ایسے باصلاحیت اور معتمد نمائندوں کو منتخب کرنے کا اختیار رکھتی ہے جو قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کے پوری طرح ۔۔۔ اہل ہوں، لیکن بالآخر اسے ان منتخب لوگوں کے کام پر ہی اعتماد کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جمہوریت کے کٹر پرستار بھی جمہور کے حق کا یہ احمقانہ مفہوم نہیں سمجھتے کہ جمہور کا ہر فرد ریاستی معاملات کے ہر ہر جز میں دخل انداز ہو سکتا ہے، بلکہ ان کے نزدیک بھی ہر فن کو اس کے منتخب ماہرین کے سپرد کیا جاتا ہے، پھر جو لوگ اس فن کی واقفیت نہیں رکھتے وہ ان ماہرین پر اعتماد کرتے ہیں، اور اس کو کوئی یہ نہیں کہتا کہ جمہور سے ان کا حق چھین لیا گیا ہے۔

جمہور کے حق کے اس تجزیے کے بعد آپ خود ہی فیصلہ فرما لیجئے کہ اس ملک کے دس کروڑ مسلمان قرآن و سنت کی تشریح کے معاملے میں کن لوگوں پر اعتماد کرتے ہیں؟ جب انہیں قرآن و سنت کا کوئی حکم سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ادارۂ تحقیقات اسلامی یا کسی اور تجدد پسند ادارے کا رخ کرتے ہیں یا ان "رجعت پسند" علماء کا جنہوں نے بقول آپ کے جمہور کا حق چھین رکھا ہے؟ اگر جمہور مسلمان کتاب و سنت کے معاملے میں بغیر کسی جبر واکراہ اور قانونی پابندیوں کے ان ہی بوریئے پر بیٹھنے والے علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں، ان ہی پر اعتماد کرتے ہیں، انہی کی بات پر ان کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے ـــــ اور کون ہے جو اس امر واقعہ کا انکار کر سکے۔ تو آپ خود ہی غور فرما لیجئے کہ جمہور کا حق کس صورت میں پامال ہوتا ہے؟ ان علماء کو کتاب و سنت کی تشریح کا حق دے کر؟ یا ان تجدد پسند حضرات کو قرآن و سنت پر "مشقِ ستم" کی کھلی چھٹی دے کر جن کی تحریف کے نشتر نے جمہور کے دلوں کو زخمی کیا ہوا ہے۔

آخر میں ان حضرات کو سب سے بڑا اعتراض اس "تقویٰ" کی شرط سے ہے، ان کے نزدیک کتاب و سنت کی تشریح کے لئے "علم" کی طرح "تقویٰ" بھی ضروری نہیں ہونا چاہئے، اور اس معاملے میں نہ جانے کس "اندیشے" کے پیش نظر ان کے نزدیک سب سے بڑی پیچیدگی یہ ہے کہ:-

"اہل تقویٰ کی شرط ایک ایسی شرط ہے کہ ہر عالم اپنے فتوے کے خلاف دوسرے کی رائے کو اس بناء پر بڑی آسانی سے مسترد کر سکتا ہے، کیوں کہ تقویٰ کو جانچنے کا معیار اپنا اپنا ہوتا ہے۔" (فکر و نظر نومبر ۶۷ء ص ۳۳۴)

اس پر ہم اس کے سوا اور کیا عرض کریں کہ اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے "انفرادی اندیشوں" سے ذرا بلند ہو کر غور فرمائیں گے تو اس معاملے میں بھی کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہے گی، وہی جمہور جن کو آپ قانون سازی کا حق دلانا چاہتے ہیں۔ اس بات کا فیصلہ بھی کرنے کے مجاز ہیں کہ کس شخص میں "تقویٰ" کی یہ شرط پائی جاتی ہے؟ جمہور مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر غلط نہیں ہوتا، ان کی زبان "نقارہ خدا" ہے جس شخص کے "تقویٰ" پر جمہور کو اعتماد ہو، اسے کتاب و سنت کی تشریح کا کام سونپ دینے میں کیا قباحت ہے ـــــ؟

خوب سمجھ لیجئے کہ تقویٰ کوئی مبہم اور غیر متعین صفت نہیں ہے جس کی تعریف ہر شخص اپنے مزاج و مذاق کے مطابق کر سکتا ہو، "تقویٰ" اسلام میں ایک قانونی اصطلاح ہے، اور اس پر بے شمار شرعی احکام کا دارومدار ہے۔ جب بھی اس کو کسی قانونی مفہوم میں استعمال کیا جائے گا، اس سے مراد مامورات پر عمل، کبائر سے پرہیز اور صغائر پر اصرار سے اجتناب ہوتا ہے، جو قرآنی اصطلاح کے مطابق "فجور" کی ضد ہے۔ ارشاد ہے:۔ فالھمہا فجورھا وتقواھا

لہٰذا جو شخص "فجور" یعنی ظاہری گناہوں سے پرہیز کرتا ہو، وہ اس قانونی اصطلاح کے مطابق "متقی" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کے "تقویٰ" کا فیصلہ کرنے کے لئے جمہور کو کوئی قابل ذکر الجھن پیش نہیں آسکتی ـــــ ان گزارشات کو ذہن میں رکھ کر فرمایئے کہ تشریح کتاب و سنت کے لئے "علم" اور "تقویٰ" کی شرط لگانے میں کیا الجھن اور کیا پیچیدگی ہے؟

آخر میں ہم ایک بار پھر "تجدد پسند" حضرات سے یہ مخلصانہ گزارش کریں گے کہ علمی اور فکری مباحث میں چلتے ہوئے نعرے چھوڑ دینے اور خالص پروپیگنڈا کے ہتھیاروں کو استعمال کرنے سے نہ ملک و قوم کی کوئی خدمت انجام دی جا سکتی ہے، نہ اس سے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ کسی سنجیدہ ذہن پر اس طرز عمل کا کوئی اچھا اثر مرتب ہوتا ہے، ان نعروں کے نقار خانے میں زیادہ سے زیادہ ایک مختصر عرصے کے لئے آپ حق کی آواز کو گم کر سکتے ہیں، لیکن اس سے صرف کان متاثر ہوتے ہیں، دل نہیں، ایک مرحلہ آتا ہے کہ نعرہ لگانے والوں کی آواز بیٹھ

جاتی ہے، ان کے حلق خشک ہو جاتے ہیں۔ اس وقت حق کی بلند تر آواز پوری قوت کے ساتھ ابھرتی ہے، براہ راست دلوں کو متاثر کرتی ہے، اور ہمیشہ کے لئے ان میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ فاما الزبد فیذھب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض!

سائنس اور اسلام

"چاند سورج اور سیاروں کے بارے میں موجودہ سائنس کی جو تحقیق ہے کیا وہ قرآن کریم کی رو سے درست ہے؟ یہاں بعض حضرات کہتے ہیں کہ سائنس اور قرآن و حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، لہٰذا اس کی ہر بات درست ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ سائنس کے نظریات قرآن سے ٹکراتے ہیں، براہ کرم اس معاملے میں اپنی جامع و بلیغ رائے سے مطلع فرمایئے" (عبدالحئی فرید پور، مشرقی پاکستان)

آپ کا سوال اپنے جواب کے لئے در حقیقت ایک مبسوط مقالے کی وسعت چاہتا ہے، تاہم اصولی طور پر چند ضروری باتیں پیش خدمت ہیں، امید ہے کہ وہ آپ کی الجھن دور کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

۱۔ سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجئے کہ سائنس کا بنیادی مقصد ان قوتوں کا دریافت کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ودیعت فرمائی ہیں، اگر ان قوتوں کو انسانیت کی فلاح و بہبود میں استعمال کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اسلام کی نظر میں نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ اسلام ان کی کوششوں کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کی بجائے ان کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ ان قوتوں کو ان مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے جو اسلام کی نظر میں جائز اور مفید ہیں، دوسرے الفاظ میں سائنس کا کام یہ ہے کہ وہ کائنات کی پوشیدہ قوتوں کو دریافت کرے، لیکن ان قوتوں کا صحیح مصرف مذہب بتاتا ہے۔ وہی ان انتھک کوششوں کے لئے صحیح رخ اور بہتر فضا مہیا کرتا ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی اسی وقت انسانیت کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے جب اسے اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے، ورنہ شاید اس سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ سائنس جس طرح انسانیت کے لئے مادی

فلاح و بہبود کا باعث بن سکتی ہے۔ اسی طرح اگر اس کا غلط استعمال کیا جائے تو وہ ہمارے لئے تباہ کن بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ مثال ہمارے سامنے ہے کہ ماضی میں سائنس نے جہاں انسانیت کو راحت و آسائش کے اسباب مہیا کئے ہیں، وہاں اس کے غلط استعمال سے پوری دنیا کو بدامنی اور بے چینی کا جہنم بھی بنا دیا ہے۔ سائنس ہی نے سفر کے تیز رفتار ذرائع بھی ایجاد کئے ہیں اور اسی نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بھی بنائے۔ لہٰذا سائنس کا صحیح فائدہ اسی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے۔

۲۔ دوسری بات یہ سمجھنے کی ہے کہ سائنس کی تحقیقات دو طرح کی ہیں، ایک وہ جو صریح مشاہدہ پر مبنی ہیں۔ ایسی تحقیقات نہ کبھی قرآن و سنت سے متصادم ہوئی ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں، بلکہ مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایسی تحقیقات نے ہمیشہ قرآن و سنت کی تصدیق ہی کی ہے۔ اور قرآن و سنت کی بہت سی وہ باتیں جو کچھ عرصہ پہلے لوگوں کی سمجھ میں ذرا مشکل سے آتی تھیں، سائنس کی تحقیقات نے ان کا سمجھنا آسان بنا دیا ہے۔ مثلاً معراج کے موقعہ پر براق کی جس تیز رفتاری کا ذکر صحیح احادیث میں آیا ہے قدیم زمانے کے عام لوگ عقل سے بہت بعید از قیاس سمجھتے تھے، لیکن کیا آج سائنس نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ تیز رفتاری ایک ایسی صفت ہے جس کو کسی حد میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری قسم کے سائنسی نظریات وہ ہیں جو مشاہدہ اور یقین کے بجائے ظن و تخمین پر یا کم علمی پر مبنی ہیں، اور اس سلسلے میں سائنس داں کسی یقینی نتیجہ پر ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں، ایسی تحقیقات بعض اوقات قرآن و سنت کی تصریحات سے ٹکراتی ہیں، ایسے مواقع پر سیدھا اور صاف راستہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تصریحات میں کوئی تاویل کئے بغیر ان پر ایمان رکھا جائے۔ اور سائنس کی جو تحقیقات ان سے ٹکراتی ہیں ان کے بارے میں یہ یقین رکھا جائے کہ سائنس ابھی اپنی کم علمی کی بناء پر اصل حقیقت تک نہیں پہنچی، جوں جوں انسان کی سائنسی معلومات میں اضافہ ہوگا قرآن و سنت کے بیان کئے ہوئے حقائق واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

مثلاً بعض سائنس دانوں کا یہ خیال ہے کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں ہے، ظاہر ہے ان کا یہ خیال اس بناء پر قائم نہیں ہوا تھا کہ انہیں آسمان کے موجود نہ ہونے کی کوئی دلیل قطعی مل گئی ہے، بلکہ ان کے استدلال کا حاصل صرف یہ ہے کہ ہمیں آسمان کے وجود کا علم نہیں ہو سکا، اس لئے ہم اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے دوسرے الفاظ میں یہ دلیل "علم عدم" کے بجائے "عدم علم" پر مبنی ہے۔ ۔ ۔ لہٰذا ہم ۔ جو قرآن و سنت کی تعلیمات

پر ایمان رکھتے ہیں۔ — ہم پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ان سائنس دانوں کی یہ رائے قطعی غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تصریح کے مطابق آسمان موجود ہے، مگر سائنس اپنی کم علمی کی بناء پر اسے دریافت نہیں کر سکی۔ اور اگر انسان کی سائنسی معلومات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا تو عین ممکن ہے کہ سائنس دانوں کو اپنی اس غلطی کا احساس ہو جائے، اور وہ اسی طرح آسمان کے وجود کو تسلیم کر لیں جس طرح بہت سی ان چیزوں کو تسلیم کیا ہے جن کا پہلے انکار کیا جاتا تھا۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنے کی ذہنیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ جب کسی چیز کی اہمیت ذہن پر سوار ہوتی ہے تو بسا اوقات اس میں حدود سے تجاوز ہونے لگتا ہے — اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نہایت مفید اور ضروری فنون ہیں، اور دور حاضر میں تو مسلمانوں کے لئے از حد ضروری ہے کہ ان فنون کی طرف بطور خاص توجہ دیں ان میں ترقی کی انتھک کوشش کریں، اس کے بغیر موجودہ دنیا میں ان کے لئے اپنا جائز مقام حاصل کرنا ممکن نہیں رہا، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ کوئی سائنس داں اپنے ظن و تخمین سے جس کسی نظریے کا اعلان کر دے اسے وحی کی طرح درست تسلیم کر لیا جائے۔ اور اس کی بناء پر قرآن و سنت میں تاویل و ترمیم کا دروازہ کھول دیا جائے یا اس کی بناء پر قرآن کریم میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگیں۔ خاص طور سے جب یہ شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ سائنس کے اس قسم کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔

۲۔ یاد رکھئے کہ اسلام کا معاملہ عیسائیت سے بہت مختلف ہے۔ عیسائی مذہب میں اتنی جان ہی نہیں تھی، کہ وہ زمانے کی نت نئی ضروریات اور انسان کی بڑھتی ہوئی سائنٹفک معلومات کا مقابلہ کر سکتی۔ لہٰذا سائنس اس کے لئے ایک عظیم خطرہ بن کر سامنے آئی، اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ کلیسا کے وقار کو سلامت رکھنے کے لئے یا تو سائنس کی مخالفت کرے۔ یا اپنے مذہب میں رد و بدل کرے۔ شروع میں رومن کیتھولک چرچ نے پہلے راستے کو اختیار کیا۔ اور چونکہ عوام پر اس کا اقتدار قائم تھا اس لئے گلیلیو جیسے سائنس دانوں کو بے شمار مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جب کلیسا کا اقتدار ڈھیلا پڑ گیا تو اب ان کے لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اپنے مذہب میں ترمیم کر کے اس کی نئی تشریح و تعبیر کریں، چنانچہ اہل تجدد (Modernism) کے مکتب فکر نے یہ راستہ اختیار کر لیا۔

لیکن یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ عیسائی مذہب کو انتہائی غیر فطری اور غیر معقول بنیادوں پر

کھڑا کیا گیا تھا۔ اسلام کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، وہ دین فطرت ہے، اور عقل و خرد کی کوئی دلیل اسے چیلنج نہیں کر سکتی۔ اس میں زمانے کی ہر ضرورت کو پورا کرنے اور ہر دور کی تحقیقات کے ساتھ تطبیق پانے کی پوری صلاحیت ہے۔ لہٰذا نہ ہمیں اسلام کے وقار کو سلامت رکھنے کے لئے سائنس کی مخالفت کی ضرورت ہے، نہ اسلام کو چھوڑنے کی۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ سائنس جس قدر ترقی کرے گی، اور انسان کی سائنسی معلومات میں جتنا اضافہ ہو گا اسلام کی بھی حقانیت اور واضح ہوتی چلی جائے گی، بشرطیکہ قرآن کا نقطہ نظر صحیح معنی میں ملحوظ رہے اور وہ محض قیاس و تخمین کو یقین اور مشاہدے کا درجہ نہ دے بیٹھے۔

بس یہ ہے وہ بات جو فلسفے یوں کہتے ہیں اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا چاہئے۔ جذباتی جوش کی رو میں آکر حدود سے تجاوز کرنا دانشمندی کا تقاضا نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ اس سیدھی سادی معقول بات کی وجہ سے بعض حضرات مسلسل یہ تشہیر کر رہے ہیں کہ علماء سائنس اور ٹیکنالوجی کے مخالف ہیں، اور اس میدان میں ترقی کرنا انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس الزام کے جواب میں ہم یہ دعا کرنے کے سوا کیا کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو فکر سلیم عطا کرے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا!

گزشتہ چھ ماہ کے دوران امریکہ کے سائنس دانوں نے چاند تک پہنچنے کے سلسلے میں جو تاریخی کامیابیاں حاصل کی ہیں، انہوں نے ساری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے۔ مشرق و مغرب میں اس انسانی دماغ کی دھوم مچی ہوئی ہے جس کی ترکتازیوں نے خلاء کی وسعتوں کو عبور کر کے چاند کی سطح پر کمندیں پھینکنی شروع کی ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ اپالو ہشتم اور اپالو دہم کے حیرت انگیز سفر نے انسانی ذہن کی توانائیوں کا حیرت انگیز مظاہرہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے جو یادگار کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ سائنسی نقطہ نظر سے تاریخی قدر و قیمت رکھتی ہیں، اور انہوں نے فن و تکنیک، حساب و تخمین کی صحت اور غیر معمولی حالات کی پیش بینی کو اپنے عروج تک پہنچا کر دکھایا ہے۔

ان خلائی جہازوں کے ذریعہ پہلی بار انسان نے اس قدر قریب سے چاند کا نظارہ کیا ہے۔ آج سے سو سال پہلے اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ کوئی انسان خلاء میں تیر کر چاند کے بالکل قریب تک پہنچ گیا ہے اور اس نے چاند پر زمین کے طلوع ہونے کا منظر دیکھا ہے تو یہ بات الف لیلے کی داستان معلوم ہوتی لیکن آج یہ افسانہ حقیقت بن کر سامنے آ چکا ہے۔ اب ۲۰ جولائی تک دو انسانوں کو چاند پر اتارنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، اور عجب نہیں کہ جس وقت یہ سطور قارئین تک پہنچیں، اس وقت تک سائنس کی تاریخ کا یہ عجوبہ بھی سامنے آ چکا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس خلائی سفر میں خلائی جہاز کی روانگی سے لے کر واپسی تک کا ہر مرحلہ ایک عام آدمی کے لئے نہایت حیرت انگیز ہے، اور خالص سائنسی نقطہ نظر سے یہ سفر ایک ایسا کارنامہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے، اور اگر آپ اس عظیم "کارنامے" کے مقاصد و نتائج پر غور فرمائیں تو ہارون رشید کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔

مشہور ہے کہ کسی شخص نے اس کے دربار میں ایک حیرت انگیز کرتب دکھانے کی اجازت چاہی تھی۔ اجازت مل گئی تو وہ دربار میں حاضر ہوا اور فرش کے بیچوں بیچ ایک سوئی کھڑی کر دی، اور کچھ فاصلے پر کئی سوئیاں ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ایک سوئی اٹھا کر فرش میں کھڑی ہوئی سوئی کا نشانہ لیا، اور اس کی طرف پھینک دی، پلک جھپکنے کی دیر میں حاضرین نے دیکھا کہ یہ دوسری سوئی پہلی سوئی کے ناکے میں داخل ہو کر پار ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اس نے اور ایک سوئی اٹھائی اور اس کو بھی اس طرح پہلی سوئی کے ناکے میں پار کر دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے اس نے کئی سوئیاں اسی طرح پھینکیں اور سب کی سب پار ہو گئیں، ایک میں بھی نشانہ خطا نہیں گیا۔

ہارون رشید نے یہ حیرت انگیز عمل دیکھا تو اس نے حکم دیا کہ "اس شخص کو دس دینار انعام میں دیئے جائیں اور دس کوڑے لگائے جائیں!" حاضرین نے اس "عجیب و غریب انعام" کی وجہ پوچھی تو ہارون رشید نے کہا کہ "دس دینار اس شخص کی ذہانت، نشانے کی سچائی اور اولوالعزمی کا انعام ہیں، اور دس کوڑے اس بات کی سزا ہیں کہ اس نے اپنی خداداد صلاحیتیں ایک ایسے کام میں صرف کی ہیں جس کا دین و دنیا میں کوئی فائدہ نہیں ہے——"

ہارون رشید کی حکمت و ظرافت کا یہ واقعہ موجودہ دور کی خلائی دوڑ پر بہت چسپاں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چاند تک پہنچنے کے اس کارنامے پر بھی ایک طرف ان سائنس دانوں کی تعریف و تحسین کرنے کو دل چاہتا ہے جنھوں نے اپنی ذہانت فنی مہارت اور عزم و حوصلہ کے بے مثال نمونے ریکارڈ قائم کئے ہیں، لیکن جب اس طرف نگاہ جاتی ہے کہ اس کارنامے پر نسبتاً کتنی ذہنی، مالی اور جسمانی توانائیاں صرف ہوئیں، اور ان کے نتیجے میں انسانیت کو کیا ملا؟ تو یہی کارنامہ ایک ایسا بین الاقوامی جرم نظر آتا ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔

چونکہ اس معاملے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں ذہنوں میں پائی جاتی ہیں اس لئے آج کی نشست میں ہم اسی مسئلے پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

سیدھے سادے عوام کا ایک طبقہ تو وہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ چاند اور خلاء کی تسخیر کی یہ تمام کوششیں اسلام اور قرآن و سنت سے متصادم ہیں، اور ان سے معاذاللہ قدرتِ خداوندی پر کوئی حرف آتا ہے یہاں تک کہ بعض حضرات کو تو اسلام کی محبت میں یہاں تک کہتے سنا گیا ہے کہ چاند تک پہنچنے کی تمام خبریں جھوٹی ہیں، اور ان پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر امریکہ یا روس کے سائنس دان خلاء کو عبور کر کے چاند یا مریخ

تک پہنچ جائیں تو اس سے کسی بھی معنی میں نہ قرآن و سنت کی تکذیب ہوتی ہے، نہ قدرت خداوندکریم پر معاذ اللہ کوئی حرف آتا ہے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ کوئی انسان چاند یا مریخ تک نہیں پہنچ سکتا۔

بلکہ یہ خلاء کی وسعتوں میں تیرنے والے اگر بصیرت کی آنکھیں لے کر اوپر جائیں تو انھیں قدم قدم پر قرآن و سنت کی تصدیق کے روشن دلائل نظر آئیں گے۔ وہ کھلی آنکھوں مشاہدہ کریں گے کہ جھوٹی عقلیت کے پرستار کل تک اسلام کی جن باتوں کو مذاق سمجھا کرتے تھے۔ سائنس کی یہ ترقیات انھیں انسان کے محدود ذہن سے کتنا قریب لے آئی ہیں! مثال کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کے سلسلے میں براق کی جس تیز رفتاری کا ذکر احادیث میں آتا ہے، کل تک نام نہاد عقلیت کے علمبردار اسے پریوں کا افسانہ کہا کرتے تھے لیکن کیا موجودہ دور کے خلابازوں نے ایک گھنٹے سے بھی کم مدت میں پورے کرۂ ارض کا چکر لگا کر یہ ثابت نہیں کر دیا کہ تیز رفتاری ایک ایسی صفت ہے جسے کسی حد میں محدود نہیں کیا جا سکتا اور جب امریکہ کے خلاء باز اپنے ذہن و دماغ کی محدود توانائیوں کو کام میں لا کر ایسی حیرت انگیز تیز رفتاری کا مظاہرہ کر سکتے ہیں تو کیا پروردگار عالم کی غیر محدود قدرت اس سے بدرجہا زائد تیز رفتاری کی تخلیق نہیں کر سکتی؟

غرض ہمیں مکمل یقین ہے۔ اور اس یقین کو کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی۔ کہ سائنس کے میدان میں انسانی معلومات میں جس قدر اضافہ ہو گا انسان کو قرآن و سنت کی تصدیق و تائید کر کے ان کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا بشرطیکہ سائنس اپنے حدود کار سے تجاوز نہ کرے اور محض قیاس و تخمین کو مشاہدہ کا درجہ نہ دے بیٹھے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین کوئی مسخ شدہ عیسائیت نہیں ہے جسے سائنس کی ترقیات سے ڈر کر آنکھیں بند کرنے کی ضرورت ہو۔ یہ وہ دین فطرت ہے جس نے چودہ سو سال پہلے ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان کیا تھا کہ

سنریھم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق (حم السجدۃ)

"ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں، اور خود ان کے وجود میں، یہاں تک کہ یہ بات ان پر کھل جائے گی کہ یہ (اللہ کا دین) حق ہے۔"

امام رازیؒ رحمۃ اللہ علیہ سلف سے نقل کرکے فرماتے ہیں کہ "آفاق" کی نشانیوں سے

مراد آسمان اور چاند ستاروں اور عالم عناصر اربعہ کے عجائب ہیں۔ پھر آیت میں جو کہا گیا ہے کہ "اپنی نشانیاں دکھائیں گے" اس کے بارے میں امام رازی" فرماتے ہیں۔

«ان العجائب التی اودعھا اللہ تعالیٰ فی ھذہ الاشیاء مما لا نہایۃ لھا فھو تعالیٰ یطلعھم علیٰ تلک العجائب زمانا فزمانا (تفسیر کبیر ص: ۳۸۶ ج ۷)

"اللہ نے ان اشیاء میں جو عجائب رکھے ہیں ان کی کوئی انتہا نہیں ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہر دور میں نئے عجائب دکھاتا رہے گا۔

دوسری طرف مسلمانوں ہی کا ایک گروہ وہ ہے جس کی آنکھیں سائنس کی اس شان و شوکت کو دیکھ کر اس درجہ خیرہ ہوئی جاتی ہیں کہ اس کے نزدیک سیاروں پر راکٹ پھینکنے سے زیادہ ضروری، اہم قابل تعریف اور قابل تقلید کام کوئی نہیں رہا، ایسے حضرات ان سائنسی ترقیات کا ذکر جس مرعوبیت، رشک اور حسرت کے ساتھ کرتے ہیں، وہ گویا زبان حال سے یہ کہتے ہیں کہ انسانیت کی سب سے بڑی محسن اور اس کائنات میں سب سے زیادہ خوش نصیب اور افضل و برتر قوم وہ ہے جس کے فرزندوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے اور بڑی محروم ہیں وہ قومیں جو اس "مقدس" دوڑ میں ان سے پیچھے رہ گئیں ہیں۔

آپ نے بعض لوگوں کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ — دنیا چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہی ہے، اور مسلمان ابھی تک نماز، روزے اور نکاح و طلاق کے مسائل میں لگے ہوئے ہیں — یہ فقرہ اسی مرعوب ذہنیت کا ترجمان ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ راکٹ اور مصنوعی سیارے ایجاد کرنے کے بعد مغربی اقوام زندگی کے ہر شعبے میں دوسری قوموں سے سبقت لے گئی ہیں، اور اب اپنے ہر مسئلے کا حل ان ہی کے نقوش قدم میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں انداز فکر غلط اور خطرناک ہیں۔ ہمیں اس بات کا اظہار کرنے میں قطعی کوئی تأمل نہیں کہ یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے، اور سائنس کے نقطہ نظر سے انسان کی ایک عظیم کامیابی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس "کارنامے" کی انجام دہی کی انسان کو جو قیمت ادا کرنا پڑی ہے، کیا اس کے پیش نظر یہ کارنامہ انجام دینے کے لائق بھی تھا؟

اپالو ہشتم اور اپالو نہم کی کامیابیوں سے مزے لینے والے تو بہت ہیں لیکن یہ بات کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ ان جہازوں کے ایک ایک سفر پر کیا خرچ آیا ہے؟ صرف ایک اپالو ہشتم کی "مد" وقت پر جو خرچ ہوا اس کی مقدار تھی:

ایک کھرب تیس ارب روپیہ!

(جنگ کراچی ۱۳ جنوری ۱۹۶۹ء)

واضح رہے کہ یہ رقم پاکستان کے کم از کم بیس سال کے بجٹ اور چھ سال کی قومی آمدنی کے مساوی ہے یعنی جتنا روپیہ حکومت پاکستان نے بیس سال کے عرصے میں خرچ کیا اور جتنا دس کروڑ عوام نے چھ سال میں کمایا وہ صرف ایک خلائی جہاز پر خرچ کیا گیا ہے۔

اور یہ تو صرف اپالو ہشتم کا خرچ تھا، اپالو دہم پر جو خرچ آیا، وہ یقیناً اس سے کہیں زائد ہوگا، اور ۱۶ جولائی کو جو خلائی جہاز دو انسانوں کو لے کر چاند پر اتارنے کے لئے جانے والا ہے۔ اس کے اخراجات کا اندازہ اس سے کہیں زائد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان جیسا ملک جس قدر روپیہ کم از کم ستر اسی سال میں خرچ کرتا وہ صرف ان چار خلائی جہازوں پر جنوری سے جولائی تک خرچ کیا جا چکا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس دنیا میں جگہ جگہ بھوک اور افلاس کا رونا رویا جاتا ہو، جہاں کروڑوں افراد اپنا پیٹ بھرنے کے لئے جو کی روٹی تک کے محتاج ہوں، جہاں بے شمار مریض دوا میسر نہ ہونے کی وجہ سے دم توڑ دیتے ہوں، جہاں کی تقریباً آدھی آبادی تعلیم سے ناآشنا ہو، کیا اس دنیا میں کروڑوں اور اربوں نہیں، کھربوں روپیہ خلا میں اڑا کر ضائع کر دینا کسی ایسے شخص کا کام ہو سکتا ہے جس کے دل میں انسانیت کا ادنیٰ سا درد ہو؟

اور باہر کی دنیا کو بھی چھوڑیئے، خود امریکہ میں جس نے یہ "عظیم کارنامہ" انجام دینے کا "اعزاز" حاصل کیا ہے ٹھیک اسی مہینے جس میں اپالو ہشتم پر ایک کھرب بیس ارب روپیہ خرچ کیا گیا، یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی کہ وہاں پر نو آدمیوں میں سے ایک مفلس ہے اور:

"افلاس آج کا سب سے بڑا مادی مسئلہ ہے"

(ہفت روزہ ٹائم نیویارک ۲۴ جنوری ۱۹۶۹ء ص ۲۱)

کیا ایسے ملک میں کھربوں روپیہ صرف چاند تک پہنچنے کے بے فائدہ شوق میں پھونک دینا عقل، دیانت، انصاف اور انسانی ہمدردی سے کہیں میل کھاتا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سعدیؒ نے آج کے خلائی جہازوں ہی سے خطاب کر کے کہا تھا کہ

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پرداختی

مشرق کا کوئی آدمی اس خلائی دوڑ کا دوسرا رخ دکھانے کی کوشش کرے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ مغرب کی ترقیات سے حسد کی وجہ سے کہہ رہا ہے۔ اس لئے اس موضوع پر مغرب ہی کے

ایک مشہور مورخ اور مفکر کا تبصرہ سنئے اس موضوع پر حال ہی میں برطانیہ کے ممتاز مورخ اور فلسفی ڈاکٹر آرنلڈ ٹائن بی کا ایک بڑا فکر انگیز مضمون شائع ہوا ہے، ہم یہاں اس کے کچھ اقتباسات پاکستان ٹائمز سے تلخیص و ترجمہ کر کے پیش کرتے ہیں۔ وہ ان خلائی کارناموں کی حیرت انگیزی کا اعتراف کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"لیکن آج بھی امریکہ کی دس فیصد یا بیس فیصد آبادی افلاس زدہ افراد پر مشتمل ہے، اور اگر دنیا کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کا صرف ایک تہائی حصہ ایسا ہے جسے صحیح طریقے سے خوراک مل رہی ہے۔ لہٰذا بنی نوع انسان کی معاشی قوت کا صحیح مصرف یہ ہرگز نہیں ہے کہ اہرام مصر بنانے یا چاند تک پہنچنے کی حماقتوں کا ارتکاب کیا جائے جو بذات خود جرائم کی فہرست میں آتے ہیں۔"

آج کی دنیا تین جنگوں میں مبتلا ہے، یہاں صنعتی ہڑتالوں کا بازار گرم ہے، یہاں طلباء احتجاج کر رہے ہیں اور دہشت انگیزی کے مختلف طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں، اور یہ سب کچھ اس شرمناک احساس کے ماتحت ہو رہا ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی تکلیف پہنچی ہے تو تشدد ہی ایک واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے ہم جنس افراد کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکتا ہے۔"

"روس اور امریکہ کے لوگ ایک دوسرے کو ان خلائی کامیابیوں پر مبارک باد پیش کرتے رہتے ہیں، حالاں کہ ان کی رقیبانہ کاوشیں ہی در حقیقت اس "حماقت" کا سب سے بڑا سبب ہیں، اگر زمین کے ایک چھوٹے سے سیارے پر یہ دو بڑی سیاسی طاقتیں ایک دوسرے کے مدمقابل نہ ہوتیں تو اس "حماقت" کا ارتکاب نہ کیا جاتا۔

جب سے انسان کے معاملات کا ریکارڈ (تاریخ کی صورت میں) ہمارے پاس موجود ہے، اس وقت سے انسان کی ٹیکنیکی ترقی اور اخلاقی زوال لازم و ملزوم ہوتے جا رہے ہیں، ہماری سائنس اور ٹیکنالوجی کی تاریخ بلاشبہ حیرت انگیز "کامیابیوں کی داستان" ہے لیکن ہمارے اخلاق و کردار کی تاریخ —— ہمارے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کی تاریخ —— اب تک ناکامیوں کی حسرت بھری داستان ثابت ہوئی ہے۔ یہ وہ اخلاقی "خلا" ہے جو ۱۹۴۵ء کے بعد

سے اتنا زیادہ وسیع ہو چکا ہے کہ اس نے تباہی کے آنے کے لئے ایک وسیع راستہ کھول دیا ہے۔"

اس ایٹمی دور میں ہمیں اولین اہمیت اس بات کو دینی چاہئے کہ ہم اپنے آپ کو دوسرے انسانوں کی جانیں ضائع کرنے کے جرم سے بچا سکیں۔ اس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک عالمی حکومت قائم کر کے مقامی حاکمیتوں کو اس کے ماتحت بنایا جائے لیکن یہ کام اب چاند پر اترنے کے "کارنامے" سے زیادہ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ اس وقت نیشنلزم (قومیت) کی حیثیت ہمارے لئے ایک بت کی سی ہے، اور ایک جھوٹے خدا کو چھوڑ بیٹھنا اس دنیا میں ایک خلاء باز کی جرأت و ہمت سے زیادہ جرأت و ہمت چاہتا ہے"

ہمارے لئے دوسرے نمبر پر اہم کام یہ ہے کہ ہم اس زمین کی آبادی کے لئے خوراک کا انتظام کریں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جتنی دیر میں خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک ساری دنیا میں پھیل ہو گی، اتنی دیر میں دنیا کی آبادی کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہو گی۔ البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ دنیا کی غذائی رسد کو بڑھانے کے لئے، ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی کا اثر یہ ہونا چاہئے کہ ہر میدان میں (پیداوار) ترقی کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی جائے"

"بنی نوع انسان کے سامنے اس وقت یہ دو مقصد اہم ترین ہیں، لیکن "خلابازی" کی مہم ان میں سے کسی مقصد کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتی۔

"لہذا واقعہ یہ ہے کہ خلائی تسخیر ایک بالکل بے کار مقصد ہے، اور اس مقصد پر اپنی توانائیاں خرچ کر کے ہم اپنے آپ پر جان بوجھ کر ایک زبردست معاشی نقصان مسلط کر رہے ہیں، ہمیں معاشی مسئلے کو ایسے زمانے میں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جبکہ نوع انسان تیزی سے فاقہ کشی کی طرف بڑھ رہی ہے۔"

"ہاں اگر خلابازی کے مقصد کو ہم اپنے اچھوتے کی سب سے

آخری سطر میں رکھ دیں۔ اور جنگ کے مقصد کو اس سے بالکل اڑا دیں تو ہمارے موجدین کی ہمت، ہمارے فنکاروں کی مہارت اور ہمارے سائنس دانوں کے جذبہ تحقیق کا متبادل مصرف کیا ہوگا؟ ـــــ اس سوال کا جواب جاپان میں پہلے ہی دیا جا چکا ہے جنگ جوئی اور خلا بازی کے بجائے ہماری تحقیق کا رخ یہ ہونا چاہئے کہ ہم سمندر کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اس کے امکانی وسائل سے کام لیں۔"

"قریب ترین سیارے کے برعکس سمندر انسان کی رسائی کے دائرے میں ہے، یہ ہمارے سیارے (زمین) کے دو تہائی حصے میں پھیلا ہوا ہے، اور یہ ہمارے نامعلوم وسائل کا عظیم ترین ذخیرہ ہے" ـــــ اندازہ یہ ہے کہ سمندر ہی میں قدرتی وسائل کے عظیم الشان ذخیروں کا سب سے بڑا حصہ موجود ہے جسے ابھی تک چھیڑا نہیں گیا۔"

"انسانی تحقیق کے لئے یہ ایک بہت بڑا میدان ہے اور جذبہ تحقیق کی تسکین کے علاوہ یہ اس بات کی ضمانت بھی دے سکتا ہے کہ اگر انسانوں کی تعداد موجودہ تعداد سے دس گنا زیادہ بھی ہو جائے تو یہ آبادی بھوک سے نہیں مرے گی۔"

"ایک زرد دم والی مادہ مچھلی اپنی زندگی میں ایک ملین (دس لاکھ) انڈے دیتی ہے، لیکن عام حالات میں ان انڈوں سے صرف تین مکمل مچھلیاں پیدا ہوتی ہیں جو آخر کو بھی انڈے دے سکیں۔ لیکن جب جاپان کے "سمندری کسانوں" نے ان انڈوں کی صلاحیت کو مصنوعی طور پر ترقی دینے کی کوشش کی، اور انڈوں کے اس ذخیرے کی پرورش کر کے انھیں شکاری جانوروں سے بچایا تو اب ایک مچھلی کے انڈوں سے نکلنے والی مچھلیوں کی تعداد تین کے بجائے ایک لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔"

"جس وقت اپالو ہشتم اپنی قاتلانہ پرواز کے بعد واپس آیا تو اس کے چند گھنٹوں کے بعد اٹلانٹک کے پار سے میرے پاس ایک ٹیلیفون کال آئی جس میں مجھ سے پوچھا گیا کہ "کیا آپ کے خیال میں یہ انسانیت کی

تاریخ کا ایک انقلابی واقعہ ہے؟" ____ میرا جواب تھا "نہیں!"
میرا جواب "ہاں" ہو سکتا تھا، اگر اس دن کی خبر یہ ہوتی کہ بنی
نوع انسان کو اچانک ہوش آگیا ہے، اور اس نے اپنی علاقائی حکومتوں
کو ایک عالمگیر وفاقی حکومت کے تابع بنا لیا ہے، اور ان کی تحقیقات نے
سمندر اور سمندر کی تہ تک پہنچ کر ایسی چیزیں دریافت کر لی ہیں
جنہیں عالم گیر حکومت بنی نوع انسان کے اجتماعی مفاد کے لئے استعمال
کرے گی۔"

ہمیں ابھی اس سچے انقلابی مقصد کو حاصل کرنا ہے۔ اور اس مقصد کی
طرف سوویت یونین اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا پہلا قدم یہ ہونا
چاہئے کہ جو وسائل وہ خلا بازی اور اسلحہ بندی پر ضائع کر رہے ہیں ان
کا رخ انسانی بہبود کی مشترک ترقی کی طرف پھیر دیں، اگر یہ کام ہو گیا
تو ساری دنیا کی آبادی کو اس معیار زندگی تک لایا جا سکے گا جو امریکہ
میں اس قصبہ عوام کو حاصل ہے"

یہ بلاشبہ ایک "انقلابی واقعہ" ہوگا، لیکن یہ مقصد محض ٹیکنالوجی
سے حاصل نہیں ہوگا۔ اگر ٹیکنالوجی کی طاقت سے ایسے ثمرات حاصل
کرنے ہیں جو شیریں ہوں اور مضرنہ ہوں تو اس کی لازمی شرط یہ ہے
کہ دل میں ایک روحانی انقلاب برپا کیا جائے، یہ روحانی سرجری ہماری
جیتی ہوئی ضرورت ہے، اور اس کے بغیر ہمارے نو دریافت مادی
وسائل بالکل بیکار ہیں، اور اگر اس کے بغیر ہم چاند پر پہنچ بھی گئے تو جو
مٹی اور راکھ ہمیں وہاں ملے گی، وہ ہمارے اس روحانی دیوالیہ پن پر
ایک بھرپور طنز ہوگی جس سے ہم اپنی مادر زمین میں نجات حاصل نہیں
کر سکے تھے۔"

(پاکستان ٹائمز ۲/ جنوری ۱۹۶۹ء کے شکریہ کے ساتھ)

ڈاکٹر ٹائن بی نے اپنے اس مضمون میں مرض کی بالکل صحیح تشخیص کی ہے۔ اور اگر آپ اس
کے اسباب پر غور فرمائیں تو اصل میں اس ساری بیماری کی جڑ یہ ہے کہ جو لوگ آج چاند کے
پیچھے دوڑ رہے ہیں، ان کے سامنے زندگی کا کوئی واضح مقصد اور بلند نصب العین نہیں ہے۔ ان

کی جدوجہد کے تمام راستے دوسروں سے آگے بڑھ جانے کی طفلانہ خواہش میں گم ہو کر رہ گئے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی تسخیر کائنات کی بے پناہ صلاحیتوں سے وہ کام نہیں لے رہے جس سے انسانیت کو امن و سکون کی منزل حاصل ہو سکے۔ ان کی تمام توانائیاں ایک دوسرے سے لڑنے، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور ایک دوسرے کو شکست دینے میں صرف ہو رہی ہیں، اور مقابلہ کی اس کشاکش میں وہ یہ بھی بھول گئے ہیں کہ انھوں نے خود اپنے آپ کو کیا نقصان پہنچا دیا ہے؟

کوئی دوڑ خواہ کتنی برق رفتار اور کتنی حیرت انگیز کیوں نہ ہو، اگر اس کی سمت صحیح اور مقصد درست نہیں ہے، تو وہ انسانیت کے لئے کوئی فائدے کی چیز نہیں ہو سکتی۔ ٹائن بی نے صحیح کہا ہے کہ سائنس سے فائدہ اٹھانے کے لئے روحانی سرجری کی ضرورت ہے۔ لیکن شاید یہ بات اس کو بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ روحانی سرجری انسانیت کے اس محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ کی اتباع کے بغیر نہیں ہو سکتی جو چاند مریخ اور زہرہ و زحل سے بھی کہیں آگے اس جہاں تک ہو کر آیا تھا جسے سائنس اب تک چشم تصور سے بھی نہیں دیکھ سکی۔ اور اس کے باوجود اس نے اپنے نام لیواؤں کو تسخیر ماہتاب کی مہم پر لگانے کے بجائے قلب و نفس کی تسخیر پر لگایا تھا۔ جب تک یہ دنیا اس " کے قدموں پر گر کر اس " سے رہنمائی کی طلب گار نہ ہو گی اس وقت تک خواہ وہ مصنوعی سیارے اڑا لے، یا چاند اور مریخ پر اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دے، اس کی بے چینیاں کبھی امن و سکون سے نہیں بدل سکیں گی، انسان کے چاند پر پہنچنے کے بعد سائنس کی ساری ترقیات انسانیت کے لئے اور ہلاکت خیز بن جائیں گی بنی نوع انسان کی بے قراریوں میں کچھ اور اضافہ ہو گا، اور کرہ ارض پر ظلم اور جہالت کا اندھیرا کچھ اور گہرا ہو جائے گا۔

شاعر مشرق نے بالکل صحیح فرمایا تھا ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور تسخیر کائنات

(تقریر برائے ریڈیو پاکستان "قرآن حکیم اور ہماری زندگی" مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۷۸ء)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

قرآن کریم نے جا بجا اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ پوری کائنات انسان کے لئے پیدا کی ہے اور اس کے ذرے ذرے کو انسان کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا

اللہ وہ ذات ہے جس نے زمین کی تمام چیزیں تمہارے لئے پیدا فرمائی ہیں

اور سورۂ جاثیہ میں ارشاد ہے:۔

و سخر لکم ما فی السمٰوات و ما فی الارض جمیعا منہ ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون (الجاثیہ: ۱۳)

اور آسمان و زمین کی تمام چیزوں کو اللہ نے اپنی طرف سے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ بلاشبہ اس میں سوچنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں

ان آیات میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت اور احسان کا تذکرہ فرمایا ہے وہاں اس طرف بھی ایک لطیف اشارہ موجود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کائنات کی یہ تمام چیزیں انسان کے لئے پیدا کی ہیں تو یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی ان نعمتوں کو پہچانے، دریافت کرنے میں اپنی بساط کے مطابق کوشش کرے، اور اللہ کی دی ہوئی عقل و فکر اور جہد و عمل کی قوت کو کام میں لاکر ان نفع بخش چیزوں تک رسائی حاصل کرے جو اللہ نے اپنے کائنات میں ودیعت فرمائی ہیں۔ کیونکہ اس کائنات میں جہاں بہت سی نعمتیں واضح اور عمومی نوعیت کی ہیں جن سے ہر انسان ہر وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے، وہاں بعض نعمتیں پوشیدہ بھی ہیں جن سے فائدہ اٹھانے کے لئے عقل

وفکر، محنت اور تجربے کی ضرورت ہے، چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

الم تروا ان اللہ سخرلکم ما فی السمٰوات و ما فی الارض و اسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ و باطنۃ (لقمان : ۲۰)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، اور تم پر اپنی تمام نعمتیں پوری کر دی ہیں، کھلی ہوئی نعمتیں بھی اور پوشیدہ نعمتیں بھی۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے ساری کائنات کو مسخر تو ضرور کر دیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کائنات کی ساری نعمتیں انسان کو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر میسر آ جائیں گی۔ بلکہ قرآن کریم نے فرمایا کہ ان نعمتوں میں سے بعض تو کھلی ہوئی ہیں جنہیں دریافت کرنے کے لئے کسی محنت یا عقل وفکر کی ضرورت نہیں، لیکن بعض نعمتیں پوشیدہ ہیں۔ جنہیں حاصل کرنے کے لئے عقل وفکر، تحقیق وجستجو اور تجربہ ومحنت کی ضرورت ہے۔

ایک اور جگہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

اللہ الذی سخرلکم البحر لتجری الفلک فیہ بامرہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون (الجاثیہ : ۱۲)

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں، اور تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔

اس آیت میں سمندر کو مسخر کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اللہ کا فضل تلاش کرے۔ قرآن کریم میں عام طور سے اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرنے سے مراد کسب معاش کی جدوجہد ہوا کرتی ہے، چنانچہ اس آیت کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں سمندر میں کشتی رانی پر اس لئے قدرت دی گئی تاکہ اس کے ذریعے تم تجارت کر سکو، لیکن بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس آیت میں اللہ کا فضل تلاش کرنے سے مراد تجارت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ان بیشمار نعمتوں کی تحقیق وجستجو ہے جو اللہ تعالیٰ نے سمندر میں پیدا فرمائی ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہارے لئے سمندر میں بیشمار فائدہ مند چیزیں پیدا کر کے سمندر کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم انہیں تلاش کر کے نفع اٹھاؤ۔ چنانچہ جدید سائنس کے انکشافات روز بروز اس حقیقت کو واضح کر رہے ہیں کہ سمندر اور اس کی تہ میں جس قدر معدنی اور نباتی ذخائر اور نعمتیں پوشیدہ ہیں۔ اتنی خشکی میں بھی موجود نہیں ہیں۔

پھر قرآن کریم نے کئی مقامات پر اس طرف واضح اشارے کئے ہیں کہ انسان جوں جوں تحقیق و جستجو کے میدان میں آگے بڑھتا جائے گا، اس کائنات کی نت نئی حقیقتیں اس کے سامنے آتی جائیں گی۔ مثلاً جہاں قرآن کریم نے انسانی سواریوں میں گھوڑوں اور خچروں کا ذکر فرمایا ہے وہیں ایک لطیف اشارہ اس طرف فرما دیا ہے کہ آئندہ انسان کی سواری کے لئے ایسی ایسی چیزیں پیدا ہوں گی جو ابھی انسان کے علم میں نہیں آئیں، ارشاد ہے:۔

والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینة و یخلق ما لا تعلمون

اور اللہ نے تمہارے لئے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کئے۔ تاکہ تم ان پر سواری کرو، اور (آئندہ) اللہ تعالیٰ وہ چیزیں پیدا کرے گا جنہیں تم ابھی نہیں جانتے

اس طرح اس مختصر جملے میں قرآن کریم نے قیامت تک ایجاد ہونے والی تمام سواریوں کی پیشگی خبر دے دی ہے، اور ایک جگہ ارشاد ہے:۔

سنریھم ایاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انه الحق (حم السجدہ : ۵۳)

ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے کائنات میں بھی اور خود ان کی اپنی جانوں میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ کلام سچا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں ظاہر ہونے کا سلسلہ کسی زمانے میں بند نہیں ہو گا، بلکہ قیامت تک ہر دور میں کائنات کی نت نئی حقیقتیں اور نشانیاں ظاہر ہوتی رہیں گی۔

اس موضوع پر قرآن و حدیث کے اور بہت سے ارشادات پیش کئے جا سکتے ہیں، لیکن اگر صرف ان چند آیتوں پر ہی غور کر لیا جائے تو ان سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تحقیق و جستجو، اور تجربات و انکشافات کے ذریعے کائنات کی پوشیدہ قوتوں تک رسائی حاصل کرنا اگر صحیح نیت کے ساتھ صحیح طریقے پر ہو تو وہ قرآن کریم کی نظر میں مذموم نہیں، بلکہ مطلوب ہے، اور نہ صرف یہ کہ اسلام نے ایسے سائنٹفک تجربات پر کوئی پابندی نہیں لگائی، بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کے میدان میں اپنی جد و جہد کے وہ گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کریں گے۔

البتہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اسلام نے تسخیر کائنات کا جو تصور عطا کیا ہے وہ مغرب کے مادہ پرستانہ تصور سے بہت مختلف ہے۔ مغرب نے بھی تسخیر کائنات کا بیڑا اٹھایا ہے، اور بلاشبہ اس آخری دور میں اس نے اس میدان میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی ہیں، لیکن اسلام سے اس کا سب سے پہلا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ مغرب کی تنگ نظری مادے کے اس پار کچھ دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہے، لہٰذا اس کو اپنی تحقیق و جستجو کے نتیجے میں جو نئی چیز دریافت ہوتی ہے وہ اسے محض اپنی قوت بازو اپنی عقل و فکر اور اپنی محنت و کاوش کا ثمرہ سمجھتی ہے، اسے ان تمام انکشافات کے پیچھے کسی خالق و مالک کا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ لیکن اسلام کی نظر اس محنت و جستجو اور ان تجربات اور انکشافات پر جا کر نہیں رکتی، بلکہ وہ ان سب کے پیچھے اس خالق و مالک کی قدرت کاملہ کا نظارہ کراتا ہے جس نے ایک طرف پوری کائنات کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے، اور دوسری طرف انسان کو وہ عقل و فکر اور وہ طاقت و توانائی بخشی ہے جس کے ذریعے اس نے کائنات کی عظیم طاقتوں کو رام کر لیا ہے۔ چنانچہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تسخیر کائنات کے عمل میں کوئی کامیابی حاصل کرنے کے بعد انسان کو کسی پندار یا گھمنڈ میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے خالق و مالک کے حضور سر نیاز خم کر دینا چاہئے جس نے اسے پوری کائنات پر حکمرانی کا مقام عطا کیا ہے۔ ایسے موقع پر قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ایک مومن کی پکار یہ ہوتی ہے کہ:-

سبحان الذی سخرلنا ھذا و ما کنا لہ مقرنین و انا الی ربنا لمنقلبون

(الزخرف: ۱۳)

> پاک ہے وہ ذات جس نے اس چیز کو ہمارے لئے مسخر کر دیا، اور ہم بذات خود ایسے نہ تھے کہ اس کو قابو کر لیتے، اور ہم کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

پھر تسخیر کائنات کے تصور میں اسلام اور مغرب کے درمیان دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ مغرب کی مادہ پرست ذہنیت تسخیر کائنات کو بذات خود اپنی منزل مقصود سمجھتی ہے، اس کے نزدیک انسان کی زندگی کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں کہ وہ کائنات کی نفع بخش چیزوں سے زیادہ سے زیادہ لذت اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر دنیا سے رخصت ہو جائے۔ اس کے برخلاف اسلام کی نظر میں تسخیر کائنات بذات خود کوئی مقصد نہیں، بلکہ مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ اور انسان کے راستے کی محض ایک منزل ہے، اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کو اس

پوری کائنات سے خدمت لینے کا حق اسی وقت پہنچتا ہے جب وہ خود اپنے مقصد تخلیق اور فریضہ منصبی کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بلاوجہ انسان کے ہاتھوں میں دام نہیں کر دی، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے کام کو ٹھیک ٹھیک ادا کر سکے، اور وہ کام اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔

اور اسی سلسلے میں اسلام اور مغرب کا تیسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ مغرب کے نزدیک تسخیر کائنات کی جدوجہد میں جو نئی قوت انسان کے ہاتھ آ جائے، اسے استعمال کرنے کا طریقہ بھی انسان خود اپنی عقل سے متعین کرتا ہے۔ لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جس خدا نے وہ قوت انسان کو عطا کی ہے وہی اس کے استعمال کا صحیح طریقہ بھی بتا سکتا ہے، لہٰذا ان ایجادات اور انکشافات کو اسی طرح اور انہی کاموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے۔ اور جب انسان وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر ان ایجادات کو استعمال کرنے کا طریقہ خود متعین کرتا ہے تو اس سے کائنات کی یہ بہترین تحقیق انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اسے بعض اوقات ہلاکت اور تباہی کے راستے پر ڈال دیتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چاند اور مریخ پر جھنڈے گاڑ دینے کے باوجود اس کی اپنی زندگی تاریک سے تاریک تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اسلام کا تسخیر کائنات کا تصور مغرب کے مقابلے میں زیادہ ہمہ گیر اور جامع بھی ہے، اور انسانیت کے لئے زیادہ مفید بھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسکی صحیح قدر و قیمت پہچاننے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین

اجتہاد

ربیع الاول ۱۴۰۳ھ میں وزارت مذہبی امور کے زیر اہتمام اسلام آباد میں ایک علماء کنونشن منعقد ہوا جس کے کھلے اجلاس میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب بھی تشریف فرما تھے، اس کنونشن کا ایک موضوع یہ بھی تھا کہ "ملک میں اجتہاد کے عمل کا آغاز کس طرح کیا جائے" اس موقع پر مدیر البلاغ، نے جو زبانی تقریر کی تھی، اب وہ وزارت مذہبی امور نے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے ایک کتابچے میں شائع کر دی ہے۔ یہ تقریر معمولی نظرثانی کے بعد اس مرتبہ اداریے میں پیش خدمت ہے۔

ادارہ

جناب صدر،

معزز حاضرین کرام، السلام علیکم،

میں سمجھتا ہوں کہ مختصر وقت میں اس کنونشن کی چاروں کمیٹیوں نے جو سفارشات مرتب کی ہیں وہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے بڑی خوش آئند اور بڑی حوصلہ افزاء ہیں کل جب اس پروگرام کا اعلان ہوا تھا تو یہ توقع نہیں ہو رہی تھی کہ اس مختصر وقت میں ایسی ٹھوس سفارشات

تیار ہو سکیں گی۔ لیکن بحیثیت مجموعی چاروں کمیٹیوں کی طرف سے جو سفارشات آئی ہیں وہ بڑی قابل قدر اور حوصلہ افزاء ہیں۔

چونکہ ہر آدمی کو کسی ایک کمیٹی میں رہنا تھا اور دوسری کمیٹیوں میں اس کو اپنے اظہار خیال کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے میں کسی تکرار میں پڑنے کی بجائے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جو مسائل ان کمیٹیوں کی طرف سے آئے ہیں جن میں کہ میں شامل نہیں تھا ان کے بارے میں اپنے مختصر نقطہ نظر کا اظہار کروں۔

اس کنونشن میں جس کا اصلی مقصد نفاذ اسلام کی رفتار کو تیز تر کرنا تھا۔ جو سفارشات اس کمیٹی کی طرف سے آئی ہیں میں ان کی حرف بحرف تائید کرتا ہوں اور یہ گزارش بھی کرتا ہوں کہ حکام کرام ان پر پورے غور کے ساتھ اور ان کے تمام مضمرات کے ساتھ ان کا جائزہ لیا جائے اور ان پر فوری عمل کیا جائے۔

اسی طرح اتحاد و اتفاق کی کمیٹی نے جو تجویز مرتب کی ہیں وہ بڑی حوصلہ افزاء ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ان پر عمل ہو جائے تو انشاء اللہ افتراق و انتشار کی جو وبا پھوٹی ہے، وہ اس کو روکنے میں موثر کردار ادا کر سکیں گی۔

مجھے اس وقت خصوصی طور پر جس کمیٹی کے موضوع کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے وہ تیسری کمیٹی ہے جو اجتہاد کے عمل کے سلسلے میں قائم کی گئی ہے۔ اور اس کی سفارشات جناب مولانا محمد یوسف صاحب کاکوروی اور علامہ سید محمد رضی صاحب مجتہد دونوں بزرگوں نے ایوان کے سامنے پیش کر دی ہیں۔

میری نظر میں چونکہ یہ اجتماع بڑی حد تک علماء کا ایک نمائندہ اجتماع ہے اور اس کی طرف سے جو بات بھی اس وقت طے ہو گی وہ بڑے دور رس اثرات کی حامل ہو گی۔ اس لئے میں مختصراً اجتہاد کے ضمن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے بارے میں ہمارے معاشرے کے اندر بڑی متضاد قسم کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور ان متضاد غلط فہمیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض اوقات انتہا درجے کا جمود ظاہر کیا جاتا ہے اور بعض مرتبہ انتہا درجے کی آزادی۔

میرے نزدیک اور میری یہ بات میری تنہا ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت اور فقہائے اسلام کی آراء سے ماخوذ اور مستنبط ہے۔ اجتہاد درحقیقت ایک دو دھاری تلوار ہے۔ اس اجتہاد کو اگر صحیح طور پر سمجھ کر، اس کی حدود کے اندر، اس کی شرائط کے ساتھ استعمال کیا جائے تو

اس کا نتیجہ اس عظیم الشان فقہی ذخیرہ کے طور پر سامنے آتا ہے جس پر امت مسلمہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ لیکن اگر اسی اجتہاد کے ہتھیار کو غلط استعمال کیا جائے، غلط افراد استعمال کریں، یا غلط طریقے سے استعمال کریں تو اس کا نتیجہ وہ باطل نظریات ہیں اور تحریف دین کی وہ تحریکیں ہیں جن کی تاریخ ہمیں "الملل والنحل" جیسی کتابوں کے اندر تفصیل کے ساتھ ملتی ہے اور جن کا حال یہ ہے کہ ایک زمانہ دراز تک ان کا شور دنیا نے سنا ہے لیکن آج سوائے کتابوں کے اوراق کے ان کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔

اسی اجتہاد کے ذریعے امت مسلمہ کے لئے عمل راستے تلاش کئے جا سکتے ہیں اور اسی اجتہاد کے ذریعے یہ صورت حال بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ ہمارے اسی ملک کے اندر یہ اجتہاد بھی کیا گیا کہ قرآن کریم کی جو آیت ہے "والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما " (۵: ۳۸) یعنی "چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو" تو "اجتہاد" کے ذریعے اس کی تشریح اور تعبیر یہ کی گئی ہے کہ چور مرد اور چور عورت سے مراد ہے سرمایہ دار اور "فاقطعوا ایدیھما" یعنی ہاتھ کاٹنے سے مراد یہ ہے کہ ان کی صنعتوں کو نیشنلائز کر دیا جائے اور یہ استدلال کسی ایسے آدمی کی طرف سے پیش نہیں کیا گیا کہ جس کو کوئی علمی مقام حاصل نہ ہو۔ یہ ہمارے ہی ملک میں ایک ایسے صاحب کی طرف سے باقاعدہ چھپ کر شائع ہوا ہے جن کا شمار مشہور دانشوروں میں ہوتا ہے۔

اسی طرح اسی ملک کے اندر اجتہاد کی بنیاد پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ سود حرام نہیں، اسی اجتہاد کی بنیاد پر یہ بھی کہا گیا کہ شراب حرام نہیں، اسی اجتہاد پر مغربی تہذیب کی وباء اور ہر لعنت کو حلال کرنے کی کوشش کی گئی، اور اسی کے ذریعے تحریف دین کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا گیا۔

اسی لئے میں نے عرض کیا کہ یہ دو دھاری تلوار ہے، اور میں اس کی مثال یہ دیا کرتا ہوں کہ جیسے پل صراط کا روایات میں ذکر آتا ہے کہ وہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اگر اس کی حدود اور شرائط کا لحاظ رکھے بغیر اور اس کی اہلیت کو کماحقہٗ حاصل کئے بغیر کوئی شخص یہ کام کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تحریف دین کا مرتکب ہوتا ہے اور اس سے کتنا درجے کی گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں۔

بعض حضرات اجتہاد کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی عقل اور رائے کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرلیں، عقل اور رائے کی بنیاد پر اسلامی احکامات سے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کو وہ اجتہاد سمجھتے

ہیں، یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اس چیز کو آج تک کسی شخص نے بھی اجتہاد نہیں سمجھا۔
جو شخص اس بات کو اجتہاد سمجھے تو وہ درحقیقت بہت عظیم گمراہی میں مبتلا ہے، خود حضرت معاذ
بن جبل کی وہ حدیث جس کی بنیاد پر اجتہاد کا دروازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھولا اور
جب آپ نے کھولا تو کوئی اس کو بند نہیں کر سکتا۔ اس کے اندر یہ تشریح موجود ہے کہ نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اگر کوئی بات تمہیں کتاب اللہ میں نظر نہ آئے تو تم کیسے فیصلہ کرو
گے؟ تو حضرت معاذ نے فرمایا کہ سنت پر عمل کروں گا۔ آپ نے پوچھا کہ اگر سنت میں بھی
کوئی بات نہ ہو تو پھر کیا کرو گے، تو انہوں نے فرمایا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ یہ
حدیث صراحۃً یہ بات بتا رہی ہے کہ جس چیز کے بارے میں قرآن و سنت نے کوئی
حکم دے دیا اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اگر اس کے بعد اس پر کوئی اجتہاد کیا جائے
گا تو وہ اجتہاد نہیں ہو گا وہ تحریف ہو گی۔

درحقیقت اگر ان معاملات میں، جن میں کہ قرآن و سنت نے کوئی واضح حکم دے دیا ہے اجتہاد کی
اجازت اور کھلی چھوٹ دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر بعثت انبیاء کا کوئی مقصد نہیں رہتا۔
انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تو وحی اس غرض کے لئے لے کر آتے ہیں کہ جن معاملات کے اندر
انسان اپنی عقل سے صحیح فیصلے تک نہیں پہنچ سکتا، وحی کے ذریعے اس کو اس کا صحیح راستہ دکھایا
جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ راستہ تمہارے لئے ہے۔ اگر یہ بات ہوتی کہ اپنی عقل اور
رائے سے جو تمہاری سمجھ میں آئے وہ کرلو تو پھر قرآن و سنت کے اتباع کی چنداں حاجت نہیں
تھی یہ کہہ دیا جاتا کہ ہر زمانے کے لوگ جس طرح کا طریقہ مناسب سمجھیں اور عقل کے
مطابق، اور رائے کے مطابق پائیں، مصلحت کے مطابق سمجھیں، اس کے مطابق اپنی زندگی
گزاریں۔ قرآن و سنت کو نازل کرنے کی ضرورت نہیں تھی اس لئے اجتہاد کے بارے میں سب
سے پہلے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت ہے اور یہاں سے جو قرارداد جائے اس میں اس
پہلو کی پوری رعایت ہونی چاہئے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ بعض اوقات اجتہاد کا مطلب تو یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اپنی عقل اور
رائے کو قرآن و سنت کے نام پر ٹھونسا جائے لیکن جب اجتہاد کے عمل کا نام آتا ہے تو ذہن میں
یہ تصور آتا ہے کہ گویا آج قرآن و سنت ہم پر پہلی بار نازل ہوئے ہیں اور اس چودہ سو سال کے
اندر اس کی تشریح و تعبیر پر کوئی کام نہیں ہوا، اور اب ہم اپنی عقل اور سمجھ سے جو کچھ اس کا
مطلب نکالیں گے، وہ اجتہاد ہو گا اور اسی کو نافذ کرنا چاہئے۔

یہ تصور بعض مرتبہ پھیلایا جاتا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم آج کسی خلاء میں نہیں بیٹھے ہم ایک ایسے دور میں ہیں جبکہ چودہ سو سال تک یہ امت جس کے اندر جلیل القدر صحابہ کرام، جس میں تابعین، جس میں بزرگان دین، جس میں فقہائے ملت اور سلف امت گذرے ہیں اور جنہوں نے اپنی عمریں کھپائی ہیں اس دین کو حاصل کرنے کے لئے۔ قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کے لئے جنہوں نے وہ قربانیاں دی ہیں کہ آج ہم اور آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ ایسی قربانیاں دی ہیں کہ بھوکے رہ کر روکھی سوکھی کھاکر، موٹا جھوٹا پہن کر انہوں نے قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کا فریضہ سرانجام دیا ہے اور ہمارے لئے ایک عظیم الشان ذخیرہ چھوڑا ہے۔ لہٰذا یہ تصور کرنا کہ اس سارے ذخیرے کو دریا برد کر کے اور اس سارے ذخیرے کو نظر انداز کر کے ہم آج پہلی بار براہ راست قرآن وسنت سے استنباط اور اجتہاد کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ بہت بڑی خود فریبی ہوگی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ چودہ سو سال تک قرآن وسنت پر کوئی عمل نہیں ہوا اور اس کی کوئی تشریح وتعبیر نہیں کی گئی وہ اس کو کسی طرح سمجھا نہیں گیا۔ اس لئے اجتہاد کا یہ مفہوم بھی اگر کسی کے ذہن میں ہے کہ وہ ماضی کے فقہی ذخیرے سے بے نیاز ہو کر از سر نو الف ب سے اجتہاد شروع کرے تو میں اس کی تائید نہیں کر سکتا۔ اجتہاد کا یہ تصور بڑا فتنہ انگیز ہے کہ تمام فقہی ذخیروں کو نظر انداز کر کے پھر آج از سر نو ان مسائل کو اٹھایا جائے اور از سر نو فقہ کو ایجاد کر ایک نئی فقہ تیار کی جائے۔

البتہ تیسری بات یہ ہے کہ جو پرانے اصول قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں۔ ان کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کیا جائے اجتہاد کا یہ مفہوم درست ہے۔ بلاشبہ بے شمار مسائل ہر دور کے اندر ایسے پیدا ہوتے ہیں کہ ان کا صریح حل ہمیں کتاب اللہ میں یا سنت میں نہیں ملتا۔ اسی طرح فقہائے کرام کی آراء میں یا تو ان کا ذکر نہیں ہوتا، یا ان کی کما حقہٗ صراحت اور وضاحت نہیں ہوتی۔ اسی دائرے کے اندر رہتے ہوئے ان مسائل کا حل تلاش کرنا اور اس کے لئے شارع کی مراد کو سمجھنا، اور شریعت کی مراد کو سمجھنا اس کا نام اجتہاد ہے اور یہ اجتہاد وہ چیز ہے کہ آج تک کسی نے اس کا دروازہ بند نہیں کیا۔

یہ پروپیگنڈہ بالکل غلط ہے کہ اس اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ اسکا دروازہ کسی نے بند نہیں کیا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھولا ہوا دروازہ ہے۔ جو قیامت تک کھلا رہے گا اور جب تک اجتہاد اس کے اہل لوگوں کے ہاتھ میں رہے گا کوئی اس کو بند نہیں کر سکتا۔ یہ

تیسری قسم کا اجتہاد ہے جو ہمیں اس دور کے اندر مطلوب ہے بے شمار مسائل ہمارے سامنے ایسے آئے ہیں کہ جن کا صریح حکم ہمیں پہلے نہیں ملتا یا یہ کہ اس کے اندر ہمیں عملی دشواریاں پیش آتی ہیں تو ان کو حل کرنے کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

یہاں میں یہ بات عرض کر دوں کہ اس کمیٹی کے لئے عنوان جو رکھا گیا تھا وہ یہ تھا کہ "پاکستان میں اجتہاد کے عمل کا آغاز کس طرح کیا جائے" اس کے پس منظر میں یہ مفروضہ جھلکتا نظر آتا ہے کہ اب تک یہ عمل نہیں ہو رہا تھا اور اب ایک ایسے عمل کا آغاز کیا جا رہا ہے جو پہلے نہیں ہوا تھا۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ صورت حال ایسی نہیں ہے جو اجتہاد مطلوب ہے اور جس اجتہاد کی اس دنیا میں امت مسلمہ کو ضرورت ہے وہ ایسا نہیں ہے جو پہلے نہ ہو تا رہا ہو۔ وہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور اب بہرحال اگر اس کو کوئی تنظیمی شکل دی جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو اچھی بات ہے لیکن یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ علماء کرام اس سے پہلے اجتہاد نہیں کرتے رہے ہیں۔ جس قسم کا اجتہاد مطلوب ہے وہ پہلے بھی کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

یہ تو تھیں چند اصولی باتیں، ہمارے سامنے جو تجویز آئی ہے وہ یہ ہے کہ اس غرض کے لئے علمائے کرام کا ایک بورڈ مقرر کیا جائے جو اجتہاد کا فریضہ انجام دے اور ان مسائل کے اندر اپنی آراء کو سامنے لائے اس سلسلے میں مجھے ایک اصولی گزارش یہ کرنی ہے کہ آپ پوری چودہ سو سالہ تاریخ کے اندر نظر ڈال کر دیکھیں تو آپ کو یہ بات محسوس ہو گی کہ اسلام نے اجتہاد کے لئے عیسائیت کی طرح کوئی مقتدر اعلیٰ تنظیم (Clvgy) قائم نہیں کی اس قسم کا کوئی ادارہ کہ جس کا قول حرف آخر ہو اور اس کے بعد کسی اور کو کچھ کہنے کی گنجائش نہ ہو اس قسم کی کوئی اداراتی تنظیم آپ کو اسلام کے اندر نظر نہیں آئے گی۔ یہ بات عیسائیت کے اندر ہے کہ اس میں جو کچھ پوپ کہہ دے، دین کی تعبیر کر دے تو اس کے بعد کسی اور کو اس کے اندر بولنے کی گنجائش نہیں رہتی، اس کو غلطی سے بالا اور مبرا و منزہ (INFALLIBLE) قرار دیا جاتا ہے۔

اسلامی اجتہاد کے اندر یہ طریق کار رہا ہے کہ عام طور پر کوئی مقتدر اعلیٰ اداراتی تنظیم قائم کر کے اس کو کوئی اجتہاد قطعی نہیں دے دیا گیا۔ بلکہ بعض علماء کے اجتہاد کے ذریعے جو کچھ آراء سامنے آتی ہیں دوسرے علماء کو ان پر تنقید کی کھلی آزادی ہوتی ہے۔ اور بالآخر قرآن و سنت کی بنیاد پر ان کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ صرف ایک طرح ہوتا ہے اور وہ یہ کہ امت مسلمہ

کا اجتماعی ضمیر کسی اجتہاد کو قبول اور کسی کو رد کر دیتا ہے۔ لہٰذا اجتہاد کے لئے کوئی بورڈ قائم کرنے سے، اگر یہ تاثر ہے کہ یہ بورڈ وہ ایسے اجتہاد کا ادارہ ہو گا جو اس معاملے میں حرف آخر کا درجہ رکھے گا، اور پھر اس کے خلاف دوسرے علماء کے لئے کوئی مخالف رائے قائم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہو گا تو یہ بھی میرے خیال میں درست نہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اس وقت اگر ہم ملک سے اجتہاد کے نام پر کوئی ادارہ قائم کریں تو اس کے کچھ عملی مسائل بھی ہیں، اور مالی مسائل بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس کے بجائے میری تجویز یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک ادارہ پہلے سے موجود ہے، اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے، اور دوسرا ادارہ، ادارہ تحقیقات اسلامی کے نام سے موجود ہے وہ اجتہادی مسائل جن کے اندر کہ استنباط و استخراج اور اجتہاد کی ضرورت ہے جیسا کہ مولانا نے فرمایا، اس کی ایک فہرست تیار کرنے کے بعد یہ کام انہی اداروں کو سونپا جائے۔ البتہ یہ جب کسی پیش آمدہ مسئلے کے حل کے لئے اجتہاد کرنا چاہیں تو اس غور و فکر کو صرف اپنے ارکان تک محدود نہ رکھیں بلکہ دوسرے علماء کو اور اہل علم کو دعوت دے کر اور ان کی آراء معلوم کر کے اور پھر اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے اس کا فیصلہ شائع ہو۔ اس طریقے سے ایک تو شاید مالی اخراجات بھی کم ہوں گے، دوسرے یہ کہ دو عملی ختم ہو گی۔ ورنہ ایک طرف آپ کا اجتہاد کا بورڈ ہو گا، اور دوسری طرف اسلامی نظریاتی کونسل ہو گی، پھر اگر ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد پیدا ہوتا ہے تو اس کو رفع کرنے کے لئے ایک تیسری کمیٹی یا تیسرا ادارہ قائم کرنا پڑے گا اس لئے اگر اسلامی نظریاتی کونسل یا ادارہ تحقیقات اسلامی کے سپرد یہ کام کیا جائے کہ وہ ایسے مسائل کی فہرست تیار کر کے ملک کے معتمد، مستند، اہل فتویٰ، اہل تقویٰ علماء کو جمع کر کے اور ان سے اس سلسلے میں رہنمائی حاصل کر لیں اور پھر کسی متفقہ نتیجے پر پہنچیں تو بہتر ہو گا۔

حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی حدیث "مجمع الزوائد" میں مروی ہے صحیح سند کے ساتھ۔ اس میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا گیا کہ یا رسول اللہؐ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ایسے مسائل بھی پیش آ سکتے ہیں کہ جن میں ہمارے پاس نہ تو آپؐ کی طرف سے امر ہے اور نہ کوئی نہی ہے تو اس صورت میں ہم کیا کریں؟ تو نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختصر الفاظ میں اس کا طریقہ کار ہمیں بتا دیا، فرمایا کہ ایسی صورت میں "شاوروا الفقہاء العابدین" ایسی صورت میں تم مشورہ کرو ایسے لوگوں سے جو فقہاء ہیں۔ دین کی سمجھ رکھنے والے اور عابدین ہیں۔ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ

کے عبادت گزار ہیں۔ "ولا تمضوا فیہ رائ خاصۃ" اور اس میں کسی خاص رائے کو اس طرح نافذ نہ کرو کہ گویا یہ پوری امت کی طرف سے اجتماعی رائے ہے۔ انفرادی آراء کی بجائے اس میں لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرو۔ اور لوگوں کی صفات بھی بتا دیں کہ جو فقہاء اور عابدین ہوں ان دو قسم کے لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کرو۔

اگر اسلامی نظریاتی کونسل اور ادارۂ تحقیقات اسلامی ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ضرورت محسوس ہو تو علماء کو جمع کریں اور اس کے بعد اس رائے کو شائع کیا جائے اور اس کے بعد دوسرے اہل علم کو اس پر تنقید کی بھی کھلی آزادی ہو اور اگر کوئی شخص اس کے خلاف کچھ کہنا چاہتا ہے تو وہ بھی کہے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی اجتہاد کا یہ عمل اپنی فطری رفتار سے چل سکتا ہے جس طرح کہ اب تک چودہ سو سال سے چلتا آ رہا ہے۔ اس کے برخلاف اگر اس کے لئے ہم کوئی مصنوعی ذرائع اختیار کریں گے تو اس کے چلنے کے امکانات مجھے نظر نہیں آتے۔

آخر میں ایک بات یہ عرض کروں گا کہ حکومت کی زیر نگرانی جو اس قسم کے ادارے قائم کئے جائیں ان میں اس بات کی رعایت انتہائی ضروری ہے کہ حکومتیں بدلتی رہتی ہیں اور لوگ آتے جاتے ہیں، اس واسطے ان کے اصول ایسے ہونے چاہئیں جو ہر حال میں قابل عمل ہوں۔ اس میں افراد کا انتخاب سیاسی بنیادوں پر ہونے کے بجائے خالص علم اور تقویٰ کی بنیاد پر ہونا چاہئے جس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، یعنی فقہاء اور عابدین کی بنیاد پر ان کا انتخاب ہونا چاہئے اور یہ بات اس ادارے کے بنیادی اصول مرفوعہ میں طے ہو تو انشاء اللہ پھر یہ اجتہاد کا عمل ہمارے لئے رحمت بنے گا، اور ہم ان خطرات سے بچ سکیں گے جو اجتہاد کے غلط استعمال سے ہمارے معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

ان توضیحات کے ساتھ میں اس کمیٹی کی تجاویز سے اتفاق کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محمد تقی عثمانی

محمد تقی عثمانی

اقدامی اور دفاعی جہاد

ـــــ ایک مکتوب اور اس کا جواب

محترم المقام جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ احقر کو حال ہی میں جناب کے موقر ماہنامہ "البلاغ" کے کچھ پرانے شمارے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ محرم الحرام ۱۳۹۱ھ (مارچ ۱۹۷۱ء) والے شمارہ کے صفحہ ۱۰ پر دفعات ۱۷، ۱۸ کے ذیل میں یہ عبارتیں ملیں:۔

"(۱۷) غیر مسلم ریاستوں میں سے جو ریاستیں اسلام اور مسلمانوں کے لئے معاندہ ہوں، ان سے مصالحانہ روابط اور حسن سلوک کا تعلق قائم کیا جا سکے گا"۔

"(۱۸) دوسرے ممالک سے کئے ہوئے معاہدات جو شرعاً جائز ہوں، ان کی پابندی کی جائے گی۔ بصورت دیگر معاہدہ کے اختتام کا اعلان کر دیا جائے گا"۔

ان دفعات سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم حکومتیں اگر وہ غیر معاند یا معاہد ہوں، اپنی غیر مسلم حیثیت کے ساتھ اسلامی حکومت کی موجودگی میں باقی رکھی جا سکتی ہیں، یعنی طاقت ہوتے ہوئے بھی اسلامی حکومت وہاں اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد نہ کرے گی، اگرچہ بقول احقر وہاں دعوت و تبلیغ ان میں بھی ترقی رہے گی، جس میں مزاحمت ہی کسی غیر مسلم حکومت کے "معاند" ہونے کا ایک کھلا ثبوت سمجھا جائے گا۔ بہرحال ان دونوں دفعات کے مضمون سے احقر کو پورا اتفاق ہے کیونکہ احقر کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا اصل کام دنیا بھر میں اسلام کی دعوت و تبلیغ ہے نہ کہ اقتدار کے کافروں کو علی الاطلاق کرہ ارض سے مٹا کر ہر جگہ حکومت اسلامی قائم کرنا (جو مولانا مودودی کا نظریہ ہے) البتہ معاند اور غیر مصالح غیر مسلم حکومتوں کو ان کے شر سے محفوظ ہونے کے لئے حفاظت خود اختیاری کے طور، ضرور زیر اقتدار لانے کی کوشش (بذریعہ اقدامی جہاد) کی جانی چاہئے۔

لیکن ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ (جون ۱۹۸۱ء) کے شمارہ میں کتاب "مختصر سیرت نبویہ" مؤلفہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی پر تبصرہ کے سلسلہ میں صفحہ ۵۱ پر ان کی مندرجہ ذیل عبارت:-

"جہاد کی مشروعیت صرف مظلوم کے لئے ہے بدفع مظالم کے لئے. بالفاظ دیگر جہاد نام ہے حفاظت خود اختیاری کا. لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مقدس کے غزوات کو مدافعانہ اور محافظانہ حیثیت سے خالی سمجھنا نہ صرف بیدینی بلکہ صریح بے عقلی ہے"۔

کتاب مذکورہ سے مقتبس کر کے جناب نے تحریر فرمایا ہے:-

"ان جملوں سے مترشح ہوتا ہے کہ صرف دفاعی جہاد جائز ہے. حالانکہ جہاد کا اصل مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے جس کا حاصل اسلام کا غلبہ قائم کرنا اور کفر کی شوکت کو توڑنا ہے۔ اس غرض کے لئے اقدامی جہاد بھی نہ صرف جائز بلکہ بسا اوقات واجب اور باعث اجر و ثواب ہے۔ قرآن و سنت کے علاوہ پوری تاریخ اسلام اس قسم کے جہاد کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ غیر مسلموں کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر خواہ مخواہ ان حقائق کا انکار یا ان میں معذرت آمیز تاویلیں کرنے کی ہمیں چنداں ضرورت نہیں۔ کسی فرد واحد کو بلا شبہ کبھی بزور مسلمان نہیں بنایا گیا. ورنہ اس کی اجازت ہے، ورنہ جزیہ کا ادارہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے. لیکن اسلام کی شوکت قائم کرنے کے لئے تلوار اٹھائی گئی ہے۔ کوئی شخص کفر کی گمراہی پر قائم رہنا چاہتا ہے تو رہے، لیکن اللہ کی بنائی ہوئی اس دنیا میں حکم اسی کا چلنا چاہیئے. اور ایک مسلمان اسی کا کلمہ بلند کرنے اور اسی کے باغیوں کی شوکت توڑنے کے لئے جہاد کرتا ہے. ہم اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے ان لوگوں کے سامنے آخر کیوں شرمائیں جن کی پوری تاریخ ملک گیری کے لئے خونریزیوں کی تاریخ ہے اور جنہوں نے محض اپنی خواہشات کا جہنم بھرنے کے لئے کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

اس تبصرہ کے متعلق مجھے جناب کی خدمت میں دو معروضات پیش کرنا ہیں۔ اول تو یہ کہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کے مقتبس جملوں سے یہ مطلب نکالنا کہ مولانا ممدوح کی نظر میں صرف دفاعی جہاد جائز ہے، بخیال احقر صحیح نہیں بلکہ وہ یہ بھی فرما رہے ہیں کہ "جہاد نام ہے حفاظت خود اختیاری کا" جس کے تحت ہر اقدامی جہاد بھی آسکتا ہے: چنانچہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی فرماتے ہیں:-

"جہاد اسلام کی مدافعت اور حفاظت خود اختیاری کے لئے ہے. اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جہاد میں ابتداء نہ کی جائے. خود ابتداء کرنے کی

غرض بھی یہی مدافعت و حفاظت ہے کیونکہ بدون غلبہ کے احتمال ہے مزاحمت کا۔ اسی مزاحمت کے انسداد کے لئے اس کا حکم کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو مدافعت غایت ہے جہاد کی وہ عام ہے مزاحمت واقع فی الحال کی مدافعت کو اور مزاحمت متوقع فی الاستقبال کی مدافعت کو"۔

(ملفوظ نمبر ۲۴۹۷ الافاضات الیومیہ جلد ششم)

مولانا عبدالشکور صاحب یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اقدامی جہادوں سے واقف ہوں گے، اس لئے وہ اقدامی جہاد کو ناجائز نہیں کہہ سکتے۔ البتہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام جہادوں کو مدافعانہ اور محافظانہ کہتے ہیں، جو صحیح ہے کیونکہ ان سب کی غرض اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت اور حفاظت خود اختیاری کے لئے کفار عرب کا زور توڑنا تھا تاکہ دین حق کو اس خطہ میں تمکین حاصل ہو۔ اور جب یہ غرض حاصل ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر ۳ سورہ مائدہ میں حجتہ الوداع کے موقع پر فرمایا۔

"آج کے دن ناامید ہو گئے کافر لوگ! تمہارے دین (کے مغلوب و گم ہو جانے) سے، سو ان (کفار) سے مت ڈرنا (کہ تمہارے دین کو گم کر سکیں) اور مجھ سے ڈرتے رہنا (یعنی میرے احکام کی مخالفت نہ کرنا)۔ آج کے دن تمہارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کر دیا (قوت میں بھی جس سے کفار کو مایوسی ہوئی اور احکام و قواعد میں بھی) اور (اس کمال سے) میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا۔ (دینی بھی کہ احکام کی تکمیل ہوئی اور دنیوی بھی کہ قوت حاصل ہوئی، اور اکمل دین میں دونوں آگئے)"۔

غرض مولانا ممدوح نے بھی "حفاظت خود اختیاری" کے ذیل میں مدافعانہ اور اقدامی دونوں ہی قسم کے جہاد مراد لئے ہیں، تاہم اگر وہ اس امر کی مزید وضاحت فرما دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا تاکہ قاری کو کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہوتی۔

دوسری بات، جو خصوصاً اس عریضہ کا محرک بنی، آپ کے تبصرہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس غرض سے کرنا ہے کہ آپ ان کی تصویب یا تردید فرما دیں (تردید کی صورت میں قرآن و سنت سے دلائل کی بھی ضرورت ہے)۔ وہ خیالات تحریر ذیل سے جناب پر واضح ہو جائیں گے:۔

آپ نے اقدامی جہاد کا اصل مقصد اعلاء کلمۃ اللہ بتایا ہے جس کا حاصل آپ کے نزدیک اسلام کا غلبہ اور اس کی شوکت قائم کرنا اور کفر کی شوکت کو توڑنا ہے۔ تاکہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں اسی کا حکم چلے۔ اس مقصد کو سمجھنے کے لئے پہلے ہمیں اعلاء کلمۃ اللہ کے معنی و مفہوم متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ احقر کے نزدیک ہر معقول، حق، صحیح اور منصفانہ بات کلمۃ اللہ یا کلمۃ الحق ہے۔ اس کو ہر غیر معقول، باطل، غلط اور غیر منصفانہ بات پر بلند یا غالب کرنا، یعنی لوگوں کے قلوب میں آخر الذکر کی دنائت اور قباحت اور اول الذکر کے علو اور محاسن کا یقین پیدا کرنے کی کوشش کرنا اعلاء کلمۃ الحق یا کلمۃ اللہ ہے۔ اور کسی چیز کے غلبہ کا مطلب اکثریت میں اس چیز کا واضح وجود ہے۔ مثلاً جہالت کے غلبہ کا مطلب لوگوں کی اکثریت کا علوم سے بے بہرہ اور جاہل رہنا ہے۔ دنیا کے غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ لوگ کثرت سے دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں، حرام حلال کی پرواہ نہیں کرتے۔ مغربیت کا غلبہ اکثریت کا مغربی تہذیب اور طرز معاشرت کو اختیار کرنا ہے۔ حنفیت کا غلبہ زیادہ تر مسلمانوں کا حنفی ہونا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ پس اسلام کے غلبہ کا مطلب یہ ہوگا کہ زیادہ تر لوگ صحیح معنوں میں اس کے پیرو ہوں۔ اور دراصل۔ اسلام کا یہی (یعنی دینی) غلبہ مطلوب ہے۔ اگر کلمۃ اللہ کے معنی "اسلام" لئے جائیں تو اعلاء کلمۃ اللہ کا مطلب اسلام کا اسی قسم کا غلبہ ہوگا، جس کے حصول کا طریقہ سوائے موثر دعوت و تبلیغ اور مبلغین اور ان کی قوم (یعنی مسلمانوں) کے مثالی اسلامی کردار کے کچھ نہیں۔ اس سے غیر مسلموں کے قلوب و اذہان میں انقلاب آسکتا ہے۔ ان کو اسلامی حکومت کی رعایا بنا لینے سے یہ مقصد چنداں حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسی صورت میں تو ان کو اپنی مغلوبیت کا احساس دعوت و تبلیغ کو کان دھر کر سننے سے ایک حد تک مانع ہوگا۔ پس اقدامی جہاد سے اسلام کا دینی غلبہ نہیں ہوتا بلکہ مسلمانوں کا سیاسی غلبہ ہوتا ہے اور انہیں کی شوکت قائم ہوتی ہے نہ کہ اسلام کی (ہماری شان و شوکت تاج کے مینار سے پوچھو)۔ اسلام کی شوکت تو یہ ہے کہ مسلمان قرآن و سنت پر پورے پورے عامل ہوں۔ سیاسی غلبہ اور شوکت کے لئے تو ان کا اچھا مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں۔ سیاسی غلبہ سے تو یہ مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا کہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا پر اسی کا حکم چلے۔ کیونکہ غیر مسلم جزیہ ادا کر کے تقریباً اپنے ہی نظام حیات کے پابند رہیں گے۔ شراب و خنزیر ان پر حرام نہ ہوں گے۔ زنا کے ارتکاب پر ان کو سنگسار نہ کیا جائے گا۔ ان کے عائلی قوانین بدستور نافذ رہیں گے۔ ان کی بت پرستی بلا روک ٹوک جاری رہے گی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کسی وجہ سے غیر مسلم رعایا کی اکثریت

ایمان نہ لائی تو یہ سیاسی غلبہ صرف اس وقت تک قائم رہے گا جب تک اسلامی حکومت طاقتور ہے ورنہ کمزور پڑنے پر غیر مسلم رعایا بغاوت کرے گی اور اپنی گذشتہ زیر دستی کا ضرورت سے زیادہ بدلہ لے گی، جیسا کہ اسپین میں اسلامی حکومت کے خاتمہ پر ہوا، یا ہندوستان میں ہو رہا ہے اگرچہ اس میں شدت تقسیم سے بھی پیدا ہوئی ہے۔

میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اقدامی جہاد کہیں بھی نہ کیا جائے۔ نہیں بلکہ معاند اور غیر مصالح غیر مسلم حکومتوں پر، جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا، استطاعت کی صورت میں اقدامی جہاد واجب ہے (بلکہ بعض اور صورتوں میں بھی واجب ہے جن کے بیان کا یہاں موقع نہیں)، تاکہ ان کا زور ٹوٹے اور وہ دعوت و تبلیغ اسلام میں مزاحم نہ رہیں۔ باقی غیر معاند اور مصالح غیر مسلم حکومتوں پر جو اپنے یہاں دعوت و تبلیغ کی اجازت دیں، اقدامی جہاد مناسب نہیں خصوصاً آج کل جب کہ توسیع پسندی کو دنیا میں بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، برخلاف اس زمانہ کے جب فتوحات کا عام رواج تھا اور یہ چیز بادشاہوں کے محاسن میں شمار ہوتی تھی۔ جن اقدامی جہادوں کے واقعات سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے، وہ سب اسی زمانہ کے ہیں۔ البتہ مسلمانوں کو اپنی فوجی طاقت زیادہ سے زیادہ بڑھائے رکھنا چاہئے تاکہ غیر مسلم حکومتیں جہاد تو درکنار محض "خوف جہاد" سے ہی مرعوب رہیں۔ قوت مرہبہ بنائے رکھنا قرآن کا بھی حکم ہے۔ ماضی میں فتوحات کا عام رواج ہونے کے باوجود مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات دیگر اقوام کی فتوحات سے ممتاز ہیں۔ دوسرے لوگوں کی فتوحات تو صرف اپنی طاقت و شوکت کے مظاہرہ کے لئے اور بقول آپ کے اپنی خواہشات کا جہنم بھرنے کے لئے ہی ہوتی تھیں، اور ان کا مقصد بالواسطہ یا بلاواسطہ ملک گیری کے علاوہ کچھ نہ تھا جبکہ مسلمانوں کو (جزیرۃ العرب، ایران و روم کے جہادوں کو چھوڑ کر جہاں ملک گیری بھی بوجہ درکار تھی) اپنی ابتدائی فتوحات کے زمانہ میں ملک گیری مقصود نہ تھی، بلکہ ان کا مطمح نظر اعلاء کلمۃ اللہ یعنی دعوت و تبلیغ اسلام تھا (جس کی محفوظ ترین صورت اس وقت ملک گیری تھی)، چنانچہ حکیم الاسلام حضرت قاری طیب صاحب فرماتے ہیں: "صحابہ کرام ظاہر میں تو جنگ کرتے تھے مگر اصل مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہی ہوتا تھا .... ان کا مقصد اگر ملک گیری ہوتا تو یہ معاہدہ نہ کرتے کہ تم اپنے ملک پر بدستور قابض رہو، صرف ہم کو اتنی اجازت دے دو کہ ہم آسانی سے اسلام کی تبلیغ کرتے رہیں۔ ہم لوگوں کو منوانے پر مجبور نہیں کریں گے ان کا جی چاہے مانیں یا نہ مانیں۔ جن لوگوں نے اس معاہدہ کو تسلیم کر لیا ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اگر ملک گیری

مقصود ہوتی تو اس معاہدہ کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ ان کے ملک پر قبضہ کر لیتے ..... بہر حال جب
غیر اقوام معاہد ذمی ہو گئیں تو ان کو چھوڑ دیا گیا اس لئے کہ اصل مقصود اعلاء کلمۃ الحق ہے۔
وہ تبلیغ کی حد تک۔ " (قاری طیب صاحب مدظلہ العالی اور ان کی مجالس" ۔ حصہ اول
ص ۲۴۷، ۲۴۸)
احقر نے اپنے (یا اپنے مشفق علیہ) خیالات سرخی سے تحریر کر دیئے ہیں تاکہ آنجناب کو
جواب میں آسانی ہو۔ زحمت کا شکریہ۔ امید ہے کہ مزاج سامی بخیر ہو گا۔ والسلام

نیاز مند

احقر سید بدر السلام عفاعنہ۔ جدہ

☆

محترمی و مکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا۔ آپ نے جہاد کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اس کا حاصل میں یہ
سمجھا ہوں کہ "اگر کوئی غیر مسلم حکومت اپنے ملک میں تبلیغ کی اجازت دے دے تو اس کے بعد
اس سے جہاد کرنا جائز نہیں رہتا"۔ اگر یہی آپ کا مقصد ہے تو احقر کو اس سے اتفاق نہیں، تبلیغ
اسلام کے راستے میں رکاوٹ صرف اسی کا نام نہیں کہ غیر مسلم حکومت تبلیغ پر قانونی پابندی
عائد کر دے، بلکہ کسی غیر مسلم حکومت کا مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ پرشوکت ہونا بذات
خود دین حق کی تبلیغ کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ آج دنیا کے بیشتر ممالک میں تبلیغ پر
کوئی قانونی پابندی عائد نہیں، لیکن چونکہ دنیا میں ان کی شوکت اور دبدبہ قائم ہے، اس لئے اسی
شوکت اور دبدبے کی وجہ سے ایک ایسی عالمگیر ذہنیت پیدا ہو گئی ہے جو قبول حق کے راستے
میں تبلیغ پر قانونی پابندی لگانے سے زیادہ بڑی رکاوٹ ہے۔

لہٰذا کفار کی اس شوکت کو توڑنا جہاد کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے، تاکہ اس شوکت کی بنا
پر جو نفسیاتی مرعوبیت لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے، وہ ٹوٹے، اور قبول حق کی راہ ہموار ہو جائے،
جب تک یہ شوکت اور دبدبہ باقی رہے گا، لوگوں کے دل اس سے مرعوب رہیں گے، اور دین
حق کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ نہ ہو سکیں گے۔ لہٰذا جہاد جاری رہے گا۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ و رسولہ ولا

یدینون دین الحق من الذین اوتو الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید و ھم صاغرون (التوبہ : ۲۹)

یہاں قتال اس وقت تک جاری رکھنے کو کہا گیا ہے جب تک کفار "جھوٹے" یا "ماتحت" ہو کر جزیہ ادا کریں۔ اگر قتال کا مقصد صرف تبلیغ کی قانونی آزادی حاصل کرنا ہوتا تو یہ فرمایا جاتا کہ "جب تک وہ تبلیغ کی اجازت نہ دے دیں" لیکن جزیہ واجب کرنا اور اس کے ساتھ ان کے صاغر (زیردست، ذلیل) ہونے کا ذکر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مقصد ان کی شوکت کو توڑنا ہے، تاکہ کفر کے سیاسی غلبے سے ذہن و دل پر مرعوبیت کے جو پردے پڑ جاتے ہیں، وہ اٹھیں، اور اس کے بعد اسلام کے محاسن پر لوگوں کو کھلے دل سے غور کرنے کا موقع ملے۔ امام رازیؒ اسی آیت کے تحت تفسیر کبیر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

لیس المقصود من اخذ الجزیۃ تقریرہ علی الکفر، بل المقصود منہا حقن دمہ و امہالہ مدۃ، رجاء انہ ربما وقف فی ھذہ المدۃ علی محاسن الاسلام وقوۃ دلائلہ فینتقل من الکفر الی الایمان فاذا امھل الکافر مدۃ، وھو یشاھد عز الاسلام، ویسمع دلائل صحتہ، ویشاھد الذل والصغار فی الکفر فالظاھر انہ یحملہ ذلک علی الانتقال الی الاسلام، فھذا ھو المقصود من شرع الجزیہ (تفسیر کبیر ص ۶۲۰ ج ۴)

> یعنی: "جزیہ کا مقصد کافروں کو کفر پر باقی رکھنا نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کی جان بچا کر اسے ایک مدت تک مہلت دی جائے جس میں یہ امید ہو گی کہ وہ اسلام کے محاسن اور اس کے مضبوط دلائل سے واقف ہو کر کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہو سکے گا پس جب کافر کو ایک مدت تک مہلت دی جائے گی، جبکہ وہ اسلام کی عزت کا مشاہدہ کر رہا ہو گا اس کی صحت کے دلائل سن رہا ہو گا، اور کفر کی ذلت کو دیکھ رہا ہو گا تو ظاہر یہ ہے کہ یہ باتیں اسے اسلام کی طرف منتقل ہونے پر آمادہ کریں گی، درحقیقت جزیہ کی مشروعیت کا مقصد یہ ہے۔"

دوسرے قابل غور بات یہ ہے کہ عہد رسالتؐ اور عہد صحابہؓ میں کیا کہیں کوئی مثال ایسی ملتی ہے کہ آپؐ نے یا صحابہ کرامؓ نے دوسرے ملکوں پر حملہ کرنے سے پہلے کوئی تبلیغی مشن

بھیجا ہو اور اس بات کا انتظار کیا ہو کہ یہ لوگ تبلیغی کام کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟ اور صرف تبلیغی مشن کو کام کرنے کی اجازت سے انکار کی صورت میں جہاد کیا گیا ہو؟ کیا روم پر حملے سے پہلے کوئی جماعت بھیجی گئی؟ یا ایران پر حملہ آور ہونے سے پہلے اس بات کی کوشش کی گئی کہ جہاد کے بغیر صرف تبلیغ سے کام چل جائے تو بہتر ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، اس سے اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکلتا ہے کہ صرف تبلیغ کی اجازت حاصل کرلینا مقصود ہی نہ تھا، اگر مقصد صرف اتنا ہی ہوتا تو بہت سے خونریز معرکوں میں صرف ایک شرط عائد کر کے جنگ بندی کی جاسکتی تھی، اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی تبلیغ پر کوئی رکاوٹ عائد نہیں کی جائے گی ــــــ لیکن کم از کم احقر کے ناقص مطالعے میں پوری تاریخ اسلام میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں صرف اتنی شرط منوا کر جنگ بند کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی گئی ہو۔ اس کے بجائے قادسیہ کے موقع پر مسلمانوں نے اپنا جو مقصد بتایا وہ یہ تھا کہ "و نخرج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ" (کامل ابن اثیر ص ۱۷۸ ج ۲) "یعنی لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لانا۔"

اسی طرح قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ (الانفال : ۳۹)

"ان سے اس وقت تک لڑو جب تک فتنہ باقی نہ رہے، اور جب تک غلبہ تمام تر اللہ ہی کا ہو جائے۔"

اس آیت کی تفسیر میں احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"دین کے معنی قہر و غلبہ کے ہیں، اس صورت میں تفسیر آیت کی یہ ہو گی کہ مسلمانوں کو کفار سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا چاہئے جب تک کہ مسلمان ان کے مظالم سے محفوظ نہ ہو جائیں، اور دین اسلام کا غلبہ نہ ہو جائے کہ وہ غیروں کے مظالم سے مسلمانوں کی حفاظت کر سکے۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں:-

"خلاصہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ مسلمانوں پر اعداء اسلام کے خلاف جہاد و قتال اس وقت تک واجب ہے جب تک کہ مسلمانوں پر ان کے مظالم کا فتنہ ختم نہ ہو جائے، اور اسلام کو سب ادیان پر غلبہ حاصل نہ

ہو جائے، اور یہ صورت صرف قرب قیامت میں ہوگی، اس لئے جہاد کا
حکم قیامت تک جاری اور باقی ہے۔"

(معارف القرآن ص ۲۳۲ ج ۴)

خلاصہ یہ ہے کہ احقر کی فہم ناقص کی حد تک جہاد کا مقصد صرف تبلیغ کی قانونی آزادی حاصل کرلینا نہیں، بلکہ کفار کی شوکت توڑنا اور مسلمانوں کی شوکت قائم کرنا ہے، تاکہ ایک طرف کسی کو مسلمانوں پر بری نگاہ ڈالنے کی جرأت نہ ہو اور دوسری طرف کفار کی شوکت سے مرعوب انسان اس مرعوبیت سے آزاد ہو کر کھلے دل سے اسلام کے محاسن کو سمجھنے پر آمادہ ہو سکیں۔ یہ حقیقت کے اعتبار سے بلاشبہ "حفاظت اسلام" ہی کی غرض سے ہے۔ اس لئے بعض علماء جنہوں نے جہاد کے لئے "حفاظت" کی تعبیر اختیار کی ہے اسی سیاق میں کی ہے۔ لیکن کفر کی شوکت کو توڑنا اور اسلام کی شوکت کو قائم کرنا اس "حفاظت" کا بنیادی عنصر ہے، لہذا اس بنیادی عنصر کو اس سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ تمام اکابر علماء نے جہاد کی غرض وغایت اسی کو قرار دیا ہے۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"جہاد کے حکم سے خداوند قدوس کا یہ ارادہ نہیں کہ یک لخت کافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ کا دین دنیا میں حاکم بن کر رہے، اور مسلمان عزت کے ساتھ زندگی بسر کریں، اور امن و عافیت کے ساتھ خدا کی عبادت اور اطاعت کر سکیں، کافروں سے کوئی خطرہ نہ رہے کہ ان کے دین میں خلل انداز ہو سکیں ـــــ اسلام اپنے دشمنوں کے نفس وجود کا دشمن نہیں، بلکہ ان کی اس شوکت و حشمت کا دشمن ہے کہ جو اسلام اور اہل اسلام کے لئے خطرے کا باعث ہو۔"

(سیرۃ المصطفیٰ ص ۳۸۸ ج ۲)

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

"حق جل شانہ کے اس ارشاد سراپا ارشاد وقاتلوھم حتیٰ لاتکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ میں اسی قسم کا جہاد مراد ہے، یعنی اے مسلمانو! تم کافروں سے یہاں تک جہاد و قتال کرو کہ کفر کا فتنہ باقی نہ رہے۔ اور اللہ کے دین کو پورا غلبہ حاصل ہو جائے۔ اس آیت میں فتنہ

سے کفر کی قوت اور شوکت کا خاتمہ مراد ہے۔ اور ویکون الدین کلہ للہ
سے دین کا ظہور اور غلبہ مراد ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: لیظہرہ
علی الدین کلہ یعنی دین کو اتنا غلبہ اور قوت حاصل ہو جائے کہ کفر کی
طاقت سے اس کے مغلوب ہونے کا احتمال باقی نہ رہے اور دین اسلام
کو کفر کے فتنے اور خطرے سے بالکلیہ اطمینان حاصل ہو جائے۔"

(تکملہ ص ۳۸۶ ج ۳)

اگر صرف تبلیغ کی اجازت حاصل ہو جانے کے بعد جہاد کی ضرورت باقی نہ رہی ہوتی تو مسلمانوں کو تبلیغ کی اجازت آج دنیا کے بیشتر ممالک میں حاصل ہے (اور شامت اعمال یہ ہے کہ یہ اجازت حاصل نہیں تو بعض مسلمان ممالک میں)۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اب مسلمانوں کو کبھی تلوار اٹھانے کی ضرورت نہ ہو، دنیا بھر میں کفر اپنی شوکت و حشمت کے جھنڈے گاڑتا رہے، دنیا کے لوگوں پر اس کے جاہ و جلال کا سکہ بیٹھا رہے، پالیسیاں اسی کی چلیں، احکام اسی کے جاری ہوں، افکار اسی کے پھیلیں، منصوبے اسی کے نافذ ہوں، اور مسلمان اس بات پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں کہ ان غیر مسلم ممالک میں ہمارے مبلغین کے داخلے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس دنیا میں کفر نے اپنی شوکت اور دبدبے کا سکہ بٹھا رکھا ہو، وہاں آپ کو تبلیغ کی اجازت مل بھی جائے تو کتنے افراد ایسے ہوں گے جو اس تبلیغ کو سنجیدگی کے ساتھ سنیں اور اس پر غور کرنے کے لئے تیار بھی ہوں گے؟ جس فضا میں سیاسی طاقت کے بل پر اسلام اور اس کی تعلیمات کے بالکل معارض افکار پوری قوت کے ساتھ پھیلائے جا رہے ہوں، اور ان کی نشر و اشاعت میں وہ وسائل بھی صرف کئے جا رہے ہوں جو مسلمان استعمال نہیں کر سکتے، وہاں تبلیغ کی اجازت حاصل ہو جانے کے باوجود وہ کس درجہ مؤثر ہو سکتی ہے؟

ہاں! اگر اسلام اور مسلمانوں کو ایسی قوت و شوکت حاصل ہو جائے جس کے مقابلے میں کفار کی قوت و شوکت مغلوب ہو، یا کم از کم وہ فتنے پیدا نہ کر سکے جن کا ذکر اوپر کیا گیا، تو اس حالت میں غیر مسلم ممالک سے پرامن معاہدوں کے ذریعے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا جہاد کے احکام کے منافی نہیں، اسی طرح جب تک کفری شوکت توڑنے کے لئے ضروری استطاعت مسلمانوں کو حاصل نہ ہو، اس وقت تک وسائل قوت کو جمع کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں سے پرامن معاہدے بھی بلاشبہ جائز ہیں۔ گویا غیر مسلم ملکوں سے معاہدے دو صورتوں میں ہو سکتے ہیں:

(۱) جن ملکوں کی قوت و شوکت سے مسلمانوں کی قوت و شوکت کو کوئی خطرہ باقی نہ رہا ہو۔ اُن سے مصالحانہ اور پر امن معاہدے کئے جا سکتے ہیں، جب تک وہ دوبارہ مسلمانوں کی شوکت کے لئے خطرہ نہ بنیں۔

(۲) مسلمانوں کے پاس جہاد بالسیف کی استطاعت نہ ہو تو استطاعت پیدا ہونے تک معاہدے کئے جا سکتے ہیں۔

آپ نے "البلاغ" کے محرم الحرام ۱۴۰۳ھ میں شائع شدہ احقر کے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے، اس میں یہی معاہدات کی صورتیں مراد ہیں، اور ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ میں احقر کے جس مضمون کا اقتباس آپ نے درج فرمایا ہے، اس میں وہ صورت مراد ہے جبکہ کفار کی شوکت مسلمانوں کی شوکت پر غالب ہو۔

لہذا آپ نے جو تحریر فرمایا ہے کہ: "معاند اور غیر مصالح اور غیر مسلم حکومتوں پر استطاعت کی صورت میں اقدامی جہاد واجب ہے، تاکہ ان کا زور ٹوٹے اور وہ دعوت و تبلیغ اسلام میں مزاحم نہ رہیں، باقی غیر معاند اور مصالح غیر مسلم حکومتوں پر، جو اپنے یہاں دعوت و تبلیغ کی اجازت دیں اقدامی جہاد مناسب نہیں ـــــ" اگر اس سے آپ کی مراد وہی بات ہے جو میں نے اوپر تفصیل سے عرض کی ہے تو درست ہے، اور اگر آپ کا منشا یہ ہے کہ صرف تبلیغ کی قانونی اجازت دینے کے بعد ایک غیر مسلم حکومت "غیر معاند اور مصالح" بن جاتی ہے اور اس سے جہاد جائز یا مناسب نہیں رہتا تو احقر کی نظر میں یہ بات درست نہیں، جس کے دلائل اوپر عرض کر چکا ہوں۔

رہا آپ کا یہ فرمانا کہ "خصوصاً آج کل جبکہ توسیع پسندی کو دنیا میں بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، برخلاف اس زمانے کے جب فتوحات کا عام رواج تھا، اور یہ چیز بادشاہوں کے محاسن میں شمار ہوتی تھی، جن اقدامی جہادوں کے واقعات سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے، وہ سب اسی زمانے کے ہیں" ـــ سو میں اس بات سے بصد ادب لیکن شدت کے ساتھ اختلاف رکھتا ہوں کیونکہ اگر اس بات کو درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی شے کے اچھے یا برے ہونے کے لئے اسلام کے پاس اپنا کوئی پیمانہ نہیں، اگر کسی زمانے میں کسی بری چیز کو "محاسن" میں شمار کیا جانے لگے تو اسلام بھی اس کے پیچھے چل پڑتا ہے، اور جس زمانے میں لوگ اسے برا سمجھنے لگیں تو اسلام بھی وہیں رک جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ "اقدامی جنگ" بذات خود کوئی مستحسن امر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو مسلمان

صرف اس بنا پر اس سے کیوں رکیں کہ "آج کل توسیع پسندی" کو دنیا میں بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اگر مستحسن نہیں، بلکہ مذموم چیز ہے تو ماضی میں اسلام نے انھیں اس سے کیوں نہیں روکا؟ اور وہ صرف اسی وجہ سے اس پر کیوں عمل پیرا رہے کہ "یہ چیز بادشاہوں کے محاسن میں شمار ہوتی تھی"؟

احقر کی رائے میں تاریخ اسلام کے اقدامی جہادوں کی یہ توجیہ اخلاقی غلط اور واقعات سے حد درجہ دور ہے۔ بات دراصل وہی ہے کہ کفر کی شوکت توڑنے کے لئے اس دور میں بھی جہاد کیا گیا ہے جب یہ چیز "بادشاہوں کے محاسن میں شمار ہوتی تھی" لیکن اس لئے نہیں کہ اس دور میں اس کا رواج عام تھا، بلکہ اس لئے کہ اللہ کے دین کی شوکت قائم کرنے کے لئے یہ چیز واقعۃً مستحسن تھی۔ ورنہ "بادشاہوں کے محاسن" میں تو یہ بات بھی شمار ہوتی تھی کہ وہ فتح کے نشے میں چور ہو کر عورتوں، بچوں اور بوڑھوں میں بھی کوئی تمیز نہ کریں۔ لیکن اسلام نے اس کے رواج عام کی بنا پر ان جیسی مذموم باتوں پر عمل گوارا نہیں کیا، بلکہ جنگ کے وہ احکام اور اصول نہ صرف وضع کئے بلکہ ان پر عمل کر کے دکھایا جو اس دور کے "بادشاہوں" کے تصور میں بھی نہ آسکتے تھے، بلکہ ان مظلوم انسانوں کے لئے بھی اچنبھے اور ناقابل یقین تھے جو بادشاہوں کے ان مظالم کے نہ صرف عادی، بلکہ ان کے مداح بن گئے تھے۔

اور جس مقصد سے اقدامی جہاد پہلے جائز تھا، اس مقصد سے آج بھی جائز ہے، اور محض اس بنا پر اس کے جواز پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ایجاد کرنے والے "امن پسند" حضرات اس پر "توسیع پسندی" کی پھبتی کستے ہیں۔ اور وہ لوگ اس پر ناک بھوں چڑھا لیتے ہیں جن کی ڈالی ہوئی غلامی کی بیڑیوں سے ایشیا اور افریقہ کی اکثر قوموں کے جسم ابھی تک لہولہان ہیں۔

اور گستاخی معاف یہ بھی مجھے تو اسی کفر کی شوکت ہی کا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے خیر و شر کے پیمانے اس عالمگیر پروپیگنڈے کی بنیاد پر بنا لئے ہیں جو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر ذہنوں میں اتار رہا ہے اور اس حد تک اتار رہا ہے کہ غیر مسلموں کی بات تو الگ رہی، خود مسلمان اس سے مرعوب ہو کر اپنے دین و مذہب کے احکام میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو رہے ہیں۔ اگر باطل کی ایسی شوکت کو توڑنا بھی "توسیع پسندی" کی تعریف میں داخل ہے تو ہمیں ایسی "توسیع پسندی" کے الزام کو پوری خود اعتمادی کے ساتھ اپنے سر لینا چاہئے۔ نہ یہ کہ ہم ان معترضین کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں

کہ "جب آپ اقدامی جہاد کو اچھا کہتے تھے تو ہم بھی اسے اچھا سمجھ کر اس پر عمل کرتے تھے، اور جب سے آپ نے اپنی کتابوں میں ــ اور صرف کتابوں میں ــ اسے برا کہنا ــ اور صرف کہنا ــ شروع کر دیا ہے، ہم نے بھی اسے اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔"

اس طرز فکر کے ساتھ اس نتیجے کے لئے اتفاق ممکن نہیں۔ والسلام

احقر

محمد تقی عثمانی

نقد و تبصرہ

اساسیات اسلام

مولفہ: مولانا محمد حنیف ندوی۔ ناشر۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ سفید کاغذ پر ۲۳ × ۱۸ سائز کے ۲۸۳ صفحات۔ کتابت و طباعت روشن۔ قیمت ساڑھے دس روپے۔

مولانا محمد حنیف ندوی صاحب علمی حلقوں میں اپنی تحریروں کی وجہ سے خاصے معروف ہیں۔ "امام غزالی" اور "ابن تیمیہ" پر ان کی متعدد کتابیں شائع اور مقبول ہو چکی ہیں۔ یہ ان کی تازہ ترین کتاب ہے جس کا تعارف ٹائیٹل پر ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:۔ "اسلام کی روشنی میں فرد اور معاشرہ کے فکری اور تہذیبی مسائل کا تجزیہ اور حل"۔ اس سے واضح ہے کہ اس کتاب کے عنوان میں اساسیات سے مصنف کی مراد اسلام کی فکری بنیادیں بھی ہیں اور عملی و تہذیبی بنیادیں بھی، چنانچہ اس کتاب میں دونوں ہی قسموں سے بحث کی گئی ہے لیکن چونکہ مصنف کا مزاج اپنی اصل کے اعتبار سے فکر و فلسفہ سے زیادہ مانوس معلوم ہوتا ہے اس لئے انہوں نے اسلام کی فکری بنیادوں پر جو بحثیں کی ہیں وہ عموماً جاندار، وقیع اور قابل تعریف ہیں اس کے برخلاف اسلام کے عملی اور تہذیبی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے اپنے خاص موضوع کے دائرے سے باہر قدم رکھا ہے لہٰذا ٹھوکریں کھائی ہیں ان مسائل میں ان کا ذہن معاملات کی قرار واقعی تحقیق کے بجائے ان چلتے ہوئے نعروں سے متاثر ہے جو تجدد کے مکتب فکر نے چھوڑ رکھے ہیں انہوں نے بھی دوسرے اہل تجدد کی طرح "اجتہاد" "غور و تدبر" "مسائل کی اصل روح" اور اس طرح کی ان مبہم اصطلاحات سے کام لیا ہے جن کا مفہوم آج تک خود وہ بھی متعین نہیں کر سکے۔ تصویر، موسیقی، نجی ملکیت اور اس جیسے مسائل میں ان کا موقف اسی مرعوب اور سپر انداز ذہنیت کا ترجمان ہے جو کسی عالم گیر پروپیگنڈے کے سامنے

جم کر بات کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

سائنس اور ٹیکنالوجی اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام ہے جو عصر حاضر کو عطا ہوا ہے اور اگر اسے سوچ سمجھ کر استعمال کیا جائے تو بلاشبہ اس میں خدمت انسانیت کی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں لیکن ہمارے یہاں ایک طبقہ وہ ہے جس کے نزدیک سائنس اور ٹیکنالوجی کوئی علم و ہنر نہیں جسے سمجھنے سیکھنے اور صحیح طریقوں سے استعمال کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کی جائیں۔ بلکہ ایک ایسا دیو استبداد ہے جس کے آگے دین و دانش کو دم مارنے کی گنجائش نہیں چنانچہ ایسے حضرات کے سامنے "سائنس" اور "ٹیکنالوجی" یا اس کی کسی ایجاد کا نام آتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں غور و فکر کے سارے حوصلوں نے جواب دے دیا ہے اور اب سوائے اس کے اندھے اتباع کے کوئی راستہ باقی نہیں رہا افسوس ہے کہ زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مؤلف اسی طبقے سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:

> سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیز رفتاریوں سے ابھر کر جو نتائج معاشرے میں پھیلتے ہیں ان کو کسی بے جان لفظی بحث اور غیر موثر عدم جواز کے فتوی سے روک دینا ممکن نہیں آخر آپ کس کس ایجاد کی مخالفت کریں گے؟ اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے سیلاب بے پناہ کے سامنے کہاں بند باندھیں گے؟" (ص ۱۳۹)

فاضل مصنف کی اس عبارت سے تاثر کچھ اس طرح کا قائم ہوتا ہے جیسے دنیا بھر کے دارالافتاء سائنس اور ٹیکنالوجی کے تمام مراکز کے خلاف یہ قسم کھا کر بیٹھے ہیں کہ ادھر کسی صنعت گاہ سے کوئی نئی ایجاد نکل کر آئے گی اور ادھر اس کی حرمت پر ایک فتویٰ صادر کر دیا جائے گا۔ لیکن کاش! فاضل مصنف یہ بھی بیان فرما دیتے کہ صنعتی انقلاب کے بعد سے کتنی ایجادات منظر عام پر آئی ہیں؟ اور ان میں سے کتنی ایجادات پر حرمت یا کراہت کا فتویٰ لگا ہے؟ اگر ان دونوں فہرستوں میں ہزار اور ایک کی نسبت بھی نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو انصاف فرمائیے ان کا یہ جملہ کہ "آپ کس کس ایجاد کی مخالفت کریں گے؟" محض پروپیگنڈے کی کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ "سائنس اور ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے سیلاب بے پناہ کے سامنے بند باندھنے کی کوشش اسلام کا کونسا نمائندہ کر رہا ہے؟ اور اگر کوئی شخص اس سیلاب بے پناہ میں سے چند قطرے نکال کر یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس زہر کو نکال دو تو یہ "سیلاب" انسانیت کے

لئے چیلنج نہیں بلکہ حیات افروز ثابت ہو سکتا ہے تو اس پر یہ بھپتی عقل و دانش کی کس دلیل سے چست ہو سکتی ہے؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر ان گنت سائنٹفک ایجادات کے لاتعداد ڈھیر میں سے صرف چند گنی چنی چیزیں اٹھا کر کوئی دارالعلوم یہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں دین و دانش کے خلاف ہیں تو تجدد کا پورا ایوان اس طرح لرز اٹھتا ہے جیسے کوئی کلمہ کفر بول دیا گیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی افادیت اور ضرورت اپنی جگہ لیکن عصر حاضر کی اس نادانی و حمق کا علاج آخر کیا ہے جو سائنس کی ہر مہلک سے مہلک ایجاد کو بھی چوم چاٹ کر قبول کرنا ضروری سمجھتی ہے اور جس کے نزدیک یہ کہنا بھی جرم ہے کہ ایٹم بم مہلک اور ہائیڈروجن بم تباہ کن ہے۔

تصویر اور موسیقی کے جواز پر گفتگو کرتے ہوئے فاضل مصنف کا طرز فکر یہ ہے کہ جو برائی یا طرز عمل عالمگیر طور پر پھیل جائے اس کے بارے میں یہ بحث ہی نہیں کرنی چاہئے کہ وہ شرعی یا عقلی نقطہ نظر سے جائز ہے یا ناجائز اس کے بجائے اسے واضح طور پر جائز قرار دے کر اس کی برائیاں کم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے فرماتے ہیں:۔

> "تصویر اور نغمہ کی بحث میں بھی اس نقطہ نظر کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ
> انداز اب یہ نہیں اختیار کرنا چاہئے کہ ان کے حق میں یا مخالفت میں جو
> دلائل محدثین اور فقہاء و صوفیاء کے درمیان اکھوان تراشح (۱) بنے
> رہے ہیں فیصلہ یہ کیا جائے کہ ان میں قوی تر کون ہے؟ کیونکہ فکر کے
> اس نہج سے کچھ ہونے والا نہیں۔ الخ (ص ۱۵۱)

لیکن اسلامی دنیا میں اس نقطہ نظر کی تبلیغ سے پہلے فاضل مصنف کو یہ ضرور سوچ لینا چاہئے تھا کہ زمانہ کے ہر اچھے برے چلن کے سامنے ہتھیار ڈال دینا دنیا کا یہی وہ طرز عمل ہے جس نے مغرب میں زنا بلکہ ہم جنس پرستی تک کو جواز کا لائسنس عطا کیا ہے۔

اس مختصر تبصرے میں مصنف کے تمام افکار پر تنقید ممکن نہیں لیکن خلاصہ یہی ہے کہ ان مسائل میں مصنف کا انداز فکر جگہ جگہ سطحیت لئے ہوئے ہے۔

فاضل مصنف کا انداز تحریر علمی، مگر خاصا شگفتہ اور دلچسپ ہے لیکن تشبیہات و استعارات کی بھرمار اور نادر ترکیبوں کی کثرت نے بعض جگہ عبارتوں کو بوجھل بھی بنا دیا ہے۔

---

(۱) فقہاء و محدثین کے دلائل پر "اکھوان تراشح" کی پھبتی بھی ایسا شرمناک جرم ہے جس پر فاضل مصنف کو ہزار بار اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔ استغفر اللہ العظیم۔

ط۱۱

اسلامی ریاست کا مالیاتی نظام

مولف:۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب۔ ناشر: ادارہ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد ۲۲x۳۰ سائز کے ۱۵۸ صفحات کتابت۔ طباعت متوسط۔ قیمت پندرہ روپیہ۔

اس کتاب کا موضوع یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست کے محاصل کیا ہوتے ہیں؟ اور ان محاصل سے وہ اپنے فرائض کس طرح ادا کر سکتی ہے؟ کتاب کے مندرجہ ذیل عنوانات سے اس کے مباحث کا اندازہ ہو سکے گا۔

اسلام کے معاشی مقاصد (۱) ٹیکس یا محصول کی تعریف. (۲) ٹیکس یا محصول کے مقاصد (۳) قبل اسلام کے مالیاتی نظام، (۴) دور رسالت کا مالیاتی نظام (۵)، خلافت راشدہ میں محاصل (۶)، اموی دور میں محاصل کی حیثیت (۷)، عباسی دور میں مالی اصلاحات (۸)، برصغیر ہندو پاک میں مسئلہ ملکیت زمین (۹)، زکوۃ اور نظام زکوۃ (۱۰)، زکوۃ کی مد سے آمدنی (۱۱)، زکوۃ کا نصاب (۱۲)، زکوۃ کے علاوہ ٹیکس (۱۳)، محاصل اور مسئلہ ملکیت زمین (۱۴)، زکوۃ کے علاوہ اسلامی ریاست کی آمدنی (۱۵)، سرمایہ کی مد اور سود (۱۶)، اسلامی نظام مالیات کے مثبت نتائج (۱۷)۔

یہ تمام موضوعات دلچسپ بھی ہیں اور تحقیق طلب بھی۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ موضوع جتنی محنت، کاوش اور تحقیق کا متقاضی تھا۔ وہ اس کتاب میں نظر نہیں آتی۔ کتاب کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مؤلف نے متعلقہ موضوعات کا تحقیقی مطالعہ کرنے کے بجائے سرسری مطالعہ کو کافی سمجھا ہے اور پہلے سے ایک ذہنی خاکہ تیار کر کے اس مطابق دلائل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں اس ذہنی خاکے کے مطابق کوئی دلیل نظر پڑ گئی ہے وہاں اس کے سیاق و سباق کو پوری طرح سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کی بلکہ اس کو فوراً درج کتاب کر دیا ہے۔

ان مختصر صفحات میں پوری کتاب پر مفصل تبصرہ تو ممکن نہیں۔ لیکن چند مثالوں سے کتاب کے پایۂ تحقیق کا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) حضرت عمرؓ نے عراق کی مفتوحہ زمینوں کو مجاہدین کے درمیان تقسیم کرنے کے بجائے ان پر سابقہ مالکوں کا قبضہ برقرار رکھا تھا اور ان پر خراج عائد کر دیا تھا۔ یہ واقعہ معروف و مشہور ہے اور اس بارے میں فقہاء کا اختلاف رہا ہے کہ آیا انہوں نے سابقہ مالکوں کی ملکیت بھی برقرار رکھی تھی؟ یا یہ زمینیں بیت المال کی ملکیت قرار پا کر انہیں بطور کرایہ دی گئی تھیں؟ زیر تبصرہ کتاب کے مؤلف نے فقہاء کے یہ دونوں نقطۂ نظر اور ان کے دلائل بیان کرنے کے بجائے اول تو پہلی رائے کو اس طرح ذکر کیا ہے جیسے یہ ایک طے شدہ بات ہے۔ اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ صرف عراق ہی نہیں، بلکہ دنیا بھر کی جو زمین بھی خراجی ہوگی وہ ریاست کی ملکیت قرار پائے گی۔ حالانکہ جس شخص نے بھی حدیث اور فقہ کی کتابوں میں عشر و خراج کے احکام تفصیل کے ساتھ پڑھے ہوں وہ کبھی اس نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا کہ ہر خراجی زمین ہمیشہ سرکاری ملکیت ہی ہوگی۔ مؤلف موصوف نے اپنی کتاب میں جا بجا حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی کتاب "اسلام کا نظام اراضی" کے حوالے دیئے ہیں۔ اگر حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا فیصلے سے متعلق وہ دوسری کتب فقہ و حدیث کو چھوڑ کر صرف اسی کتاب کا اچھی طرح سمجھ کر مطالعہ فرما لیتے تو اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے اس کے برعکس انتہا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اس نظریئے (کہ ہر خراجی زمین سرکاری ملکیت ہوتی ہے) کو حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی طرف بھی منسوب کر دیا ہے۔ چنانچہ "اسلام کا نظام اراضی" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ان کی (حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی) بیان کردہ تفصیلات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کی اراضی خراجی ہیں، لہٰذا ریاست کی ملکیت ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر انہوں نے بحث کچھ اس طرح کی ہے کہ اس کے برعکس بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ (ص ۱۵۲)

اس تبصرے سے صاف واضح ہے کہ یا تو مؤلف موصوف نے یہ پوری کتاب پڑھی نہیں ہے یا اس کو پوری طرح سمجھ نہیں پائے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ اسے سمجھ کر پڑھتے تو نہ صرف یہ کہ حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی طرف اس بات کی نسبت نہ فرماتے، بلکہ شاید خود ان کی غلط فہمی بھی دور ہو جاتی۔ ہمارا مشورہ ہے کہ مؤلف موصوف "اسلام کا نظام اراضی" میں صفحہ

۳۰ سے صفحہ ۴۸ تک کی بحث پورے غور و خوض کے ساتھ مطالعہ فرمائیں۔

(۲) "عشور" اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے جس کے تفصیلی احکام ہر فقہی کتاب کی کتاب الزکوٰۃ میں مذکور ہوتے ہیں۔ مؤلف موصوف نے اس کا ذکر کرتے ہوئے چند در چند غلطیاں کی ہیں۔ اول تو "عشور" کا ترجمہ "کسٹم ڈیوٹی" سے کیا ہے۔ حالانکہ "عشور" اور کسٹم ڈیوٹی کے مروجہ قواعد میں کافی فرق ہے۔ سمجھانے میں آسانی کے لحاظ سے اگر عنوان وغیرہ میں یہ لفظ استعمال کر لیا جائے تو کم از کم تفصیلی احکام بیان کرتے ہوئے تو اس فرق کو واضح کر دینا چاہئے۔ دوسرے مسلمانوں سے وصول کئے جانے والے "عشور" اور غیر مسلموں سے لئے جانے والے "عشور" میں کوئی فرق بیان نہیں کیا گیا بلکہ ص ۲۸ پر جہاں مؤلف موصوف نے موجودہ دور میں اسلامی ریاست کے محاصل کا تخمینہ لگایا ہے وہاں عشور کی ساری آمدنی کو زکوٰۃ سے الگ شمار کیا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں سے لئے جانے والے عشور درحقیقت زکوٰۃ ہی ہوتے ہیں۔

تیسرے "عشور" کے سلسلے میں مؤلف موصوف نے ایک غضب یہ ڈھایا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کی ایک ناتمام عبارت نقل کر کے اس سے بالکل الٹا مفہوم نکال لیا ہے لکھتے ہیں:۔

"امام ابو یوسفؒ نے اس بارے میں یہ رائے دی کہ اسلامی ریاست اس کی شرح میں اگر چاہے تو اضافہ کر سکتی ہے۔ فرماتے ہیں:

وقال عمر بن الخطاب وضع العشر فلا بأس بأخذها إذا لم يتعد فيها على الناس ويؤخذ بأكثر مما يجب عليهم

(کسٹم ڈیوٹی یا چونگی وصول کرنے کا حکم حضرت عمر بن الخطابؓ نے دیا تھا۔ لہٰذا اگر اس کی تحصیل میں لوگوں پر زیادتی نہ ہو تو اس کے وصول کرنے میں کوئی حرج نہیں اور جو ان پر واجب ہے اس سے زیادہ بھی لیا جا سکتا ہے"۔ (ص ۶۵)

اس میں خط کشیدہ جملے کا ترجمہ بالکل غلط کیا گیا ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے: "لہٰذا اگر اس کی تحصیل میں لوگوں پر زیادتی نہ ہو اور جتنا ان پر واجب ہے اس سے زیادہ وصول نہ کیا جائے تو اس کے وصول کرنے میں کوئی حرج نہیں"۔ یوں تو عربی زبان کا صحیح علم رکھنے والا ہر شخص اس کا وہی ترجمہ کرے گا جو ہم نے عرض کیا۔ لیکن امام ابو یوسفؒ نے تو اس مسئلے میں کوئی ابہام چھوڑا ہی نہیں چنانچہ وہ عشور کی بحث کا آغاز ہی ان الفاظ سے کر رہے ہیں کہ:۔

أما العشور فرأيت أن توليها قوماً من أهل الصلاح والدين وتأمرهم أن لا يتعدوا على الناس فيما يعاملونهم به فلا يظلموهم ولا يأخذوا منهم أكثر مما يجب عليهم

(کتاب الخراج ص ۱۳۲ فصل فی العشور)

جہاں تک عشور کا تعلق ہے، سو ان کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ان کی وصولیابی پر آپ صالح اور دیندار لوگوں کو مقرر کریں اور انہیں اس بات کا حکم دیں کہ وہ اپنے معاملات میں لوگوں پر ظلم نہ کریں اور جتنا ان پر واجب ہے اس سے زیادہ وصول نہ کریں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب الخراج میں اچانک "ویؤخذ باکثر مما یجب علیھم" کا لفظ مؤلف موصوف کو نظر پڑا اور وہ اپنے ذہنی خاکے کے مطابق معلوم ہوا تو اس کے بعد اس جملے کی صحیح ترکیب، اور عبارت کے سیاق و سباق پر غور کرنے کی انہوں نے ضرورت نہیں سمجھی، کتاب میں کئی مقامات پر اس ناتمام جملے کا غلط ترجمہ بار بار لکھتے چلے گئے ہیں اور اس کی بنیاد پر ص ۱۲۸ پر تو یہاں تک لکھ دیا گیا ہے کہ:۔

"عشور کے متعلق تو شریعت میں یہ گنجائش بھی موجود ہے کہ اس کی شرح میں اضافہ کیا جا سکتا ہے جیسا کہ امام ابو یوسف کے اس فتوے سے معلوم ہوتا ہے ویؤخذ باکثر مما یجب علیھم اور عشور کی مقررہ رقم سے زیادہ بھی لیا جائے۔"

(۳) مؤلف موصوف لکھتے ہیں کہ: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں گھوڑوں پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی، لیکن عمر فاروقؓ نے اپنے دور میں تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ عائد کر دی اور صحابہؓ میں سے کسی نے اختلاف نہ کیا اس طرح زکوٰۃ کی مد میں ایک نئی آمدنی کا اضافہ ہو گیا"۔ (ص ۴۹) حالانکہ یہ بات بھی موضوع کا پورا مطالعہ نہ کرنے پر مبنی ہے۔ اگر مؤلف موصوف حدیث کی کوئی مستند کتاب اس کی شرح کے ساتھ دیکھ لیتے تو انہیں یہ غلط فہمی نہ ہوتی کہ تجارت کے گھوڑوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی، اور حضرت عمرؓ نے اس مد کا اضافہ کیا تھا۔

(۴) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی کتاب "اسلام کا نظام اراضی" کے حوالے اس کتاب میں اکثر و بیشتر حیرتناک حد تک غلط انداز سے پیش کئے گئے ہیں اور حضرت

مفتی صاحب مدظلہم کی طرف ایسی ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو نہ صرف یہ کہ ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہوں گی، بلکہ ان کی کتاب کو اگر پوری طرح پڑھ لیا جائے تو خود اس میں ان باتوں کی تردید موجود ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:۔

"مفتی صاحب نے پاکستان کی زمینوں کو شرعاً وہی حیثیت دی ہے جس کی تفصیلات ہم نے اس باب میں بیان کی ہیں ۔۔۔۔ یعنی وہ اصلاً حکومت پاکستان کی ملکیت ہیں اور جن لوگوں کا ان زمینوں پر قبضہ ہے وہ اس کے اصلی مالک نہیں۔" (۷۵)

حالانکہ حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی کتاب میں نہ صرف یہ کہ اس خود ساختہ نتیجے کا اشارہ تک نہیں، بلکہ اس کی صریح تردید موجود ہے۔ حضرت مفتی صاحب کا منشاء تو یہ ہے کہ پاکستان کی متروکہ اراضی تقسیم کے بعد اصلاً حکومت پاکستان کی ملکیت تھیں جن پر اس کو مکمل اختیار حاصل تھا اور اس کے بعد حکومت نے یہ زمینیں جن افراد کو دے دیں وہ ان کے مالک ہو گئے۔

(۵) علامہ محمد خضری کی مشہور کتاب "تاریخ التشریع الاسلامی" کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف موصوف لکھتے ہیں کہ اس کا ترجمہ کرنے والے مولانا عبدالسلام ندوی جیسے مشہور عالم دین ہیں۔ اس ترجمے کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور حال ہی میں پاکستان کے کسی ادارے نے مؤلف کا نام بدل کر یہ کتاب چوری چھپے شائع کی ہے۔" حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کے جس ادارے نے یہ کتاب شائع کی ہے اس نے مولانا عبدالسلام ندوی کا ترجمہ شائع نہیں کیا، بلکہ اس کا نیا ترجمہ کرایا ہے۔ اس کے ابتدائی تقریباً ساٹھ صفحات کا ترجمہ تو راقم الحروف نے کیا ہے جس کا مولانا ندوی صاحب کے ترجمے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اگر مؤلف موصوف مولانا ندوی کے ترجمے اور اس نئے ترجمے کا مقابلہ کر کے دیکھ لیتے تو خواہ مخواہ کسی پر یہ غیر متعلق الزام عائد نہ فرماتے۔

بہر کیف یہ چند مختصر مثالیں تھیں ورنہ اس کتاب میں غلط فہمیوں،

مغالطوں، غلط مبحث اور مطالعہ کی نارسائی کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، اور یہ "ادارۂ تحقیقات اسلامی" کے معیار تحقیق کے بارے میں کوئی اچھا تاثر نہیں دے سکتی۔ (م۔ت۔ع)

تاریخ ارض القرآن

مؤلف:- حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ ناشر- دارالاشاعت ، مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی نمبر۱- ۳۶ × ۲۳ سائز کے ۴۴۴ صفحات- کتابت و طباعت متوسط- کاغذ سفید- قیمت چوبیس روپیہ-

یہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق کتاب ہے جسے تحقیقی اعتبار سے ان کا شاہکار کہنا چاہئے- قرآن کریم میں زمین کے جن خطوں کا صراحۃً یا اشارۃً ذکر آیا ہے. ان کا قدیم و جدید جغرافیہ اور ان کی تاریخ اس کتاب کا موضوع ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان علاقوں میں بسنے والی اقوام کا مفصل تعارف کرایا گیا ہے یہ ایک انتہائی مشکل موضوع تھا کیونکہ یہ ان شہروں. آبادیوں اور تہذیبوں کی کہانی ہے جو سالہا سال پہلے پیوند خاک ہو چکیں جن کے نام بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے اور جن کو یونانی اور یورپی مصنفین نے اپنی مختلف آراء کے ذریعہ خواب پریشاں بنا دیا- لیکن حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی "خواب پریشاں" سے مطلب کی باتیں نکھار نکھار کر اس کتاب میں سجا دی ہیں جغرافیہ اور اقوام سابقہ کی تاریخ راقم الحروف کا موضوع بھی نہیں رہا اس لئے اس کتاب پر حق تبصرہ ادا کرنا میرے لئے مشکل ہے تاہم ایک عام علمی ذوق کی بنیاد پر یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس کتاب کا ہر ہر صفحہ فاضل مؤلف کی وسعت معلومات تاریخی تحقیق و جستجو کے لئے دقت نظر اور شدید محنت و عرق ریزی کی گواہی دیتا ہے حضرت علامہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کی تالیف میں تمام متعلقہ عربی اور انگریزی ماخذ سے مدد لی ہے بلکہ اس مقصد کے لئے ابتدائی عبرانی زبان بھی سیکھی ہے اور مغرب کے جن مصنفین نے ان موضوعات پر لکھا ہے جابجا ان پر مدلل اور فاضلانہ تنقید بھی فرمائی ہے- فاضل مؤلف نے جدید عصری تحقیقات کو قرآن کے ماخذ کی حیثیت سے پیش کیا ہے ہر جگہ دکھایا ہے کہ یہ تحقیقات کس طرح قرآن

کی صداقت کی تصدیق کر رہی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ارض القرآن سے متعلق جغرافیائی اور تاریخی معلومات کا خزانہ ہے اور صرف اردو ہی میں نہیں، عربی اور انگریزی میں بھی ایسی کوئی دوسری کتاب ہمارے علم میں نہیں ہے۔

البتہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی یہ کتاب اس دور کی ہے جب وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے بیعت نہیں ہوئے تھے ان کی اس دور کی تالیفات میں بہت سی باتیں جمہور علمائے امت کے خلاف بھی ملتی ہیں جن سے انہوں نے بعد میں ایک اعلان عام کے ذریعہ اجمالی طور پر رجوع کر لیا تھا، اگرچہ کتابوں میں ترمیم نہیں کر پائے تھے کہ وفات ہو گئی۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی کئی باتیں جمہور علمائے امت کے خلاف باقی رہ گئی ہیں۔ مثلاً اس زمانے میں سرسید احمد خاں صاحب کے مشہور کئے ہوئے تصور فطرت (نیچریت) کا بڑا زور تھا جس کی بنیاد پر مغربی فلسفے کی واجبی معلومات رکھنے والے مصنفین نے انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا انکار کر ڈالا تھا، اور قرآن کریم میں جن معجزات کا ذکر صراحت کے ساتھ آیا ہے ان کو مادی اسباب کے تحت لانے کے لئے الفاظ قرآنی میں کھینچ تان کی مہم زوروں پر تھی اس دور میں بعض مصنفین کا انداز یہ رہا کہ انہوں نے معجزات کا اصولی طور پر تو انکار نہیں کیا لیکن ان کی کوشش یہ رہی کہ قرآن کریم میں کم سے کم معجزات کا اقرار کرنا پڑے اور ایسے واقعات کو جہاں تک ہو سکے کسی لیپ پوت کے ذریعہ ٹالا جائے چنانچہ معجزات کو اصولی طور پر تسلیم کرنے کے باوجود انہوں نے بعض جگہ قرآن کریم کی آیات میں دوری تاویلیں کی ہیں۔ سید صاحب اس کتاب میں ایسے لوگوں سے خاصے متاثر معلوم ہوتے ہیں چنانچہ انہوں نے بعض جگہ سرسید احمد خاں صاحب کی تاویلات کی صریح تردید کی ہے لیکن بعض مقامات پر خود انہوں نے اسی ذہنیت کی دوسری تاویلات کو اختیار کر لیا ہے۔

مثلاً اصحاب الفیل کا واقعہ قرآن کریم میں پوری وضاحت کے ساتھ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان پر ابابیلوں کا ایک لشکر بھیج دیا جس نے ان پر پتھر برسا کر انہیں ہلاک کر دیا لیکن معجزات سے کترانے کی ذہنیت نے ان آیات میں وہ وہ کھینچ تان کی ہے کہ الامان! سرسید احمد صاحب نے اس کے جو معنی بیان کئے تھے ان کے بارے میں تو فاضل مؤلف نے لکھا ہے:

"سرسید نے اس سورت کی جو تفسیر لکھی تھی اور جس سے اس واقعہ کے اعجوبہ پن کو دور کرنے کی کوشش کی تھی وہ سرتاپا غلط اور اغلاط سے

معلوم ہے" (ص ۲۴۷)

لیکن آگے چل کر خود ہی مولانا حمید الدین فراہی صاحب مرحوم کی بیان کی ہوئی اس تفسیر کی تائید کی ہے کہ اصحاب الفیل پرندوں کے ذریعہ نہیں، بلکہ آدمیوں کی سنگ باری سے ہلاک ہوئے تھے اور پرندوں کا یہ لشکر انہیں ہلاک کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان کی لاشیں کھانے کے لئے آیا تھا حالانکہ مولانا فراہی کی یہ تاویل قرآن کریم کے سیاق اور عقل و نقل ہر اعتبار سے بالکل غلط بھی ہے اور جمہور امت کے بالکل خلاف بھی ہے اور سوائے معجزات سے زبردستی گریز کی ذہنیت کے اس تاویل کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہد ہد جو ان کے پاس ملک سبا کی خبر لے کر آیا تھا اور وہاں کے احوال بیان کئے تھے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے پہلے تو علامہ ندویؒ نے ان "فطرت پرستوں" کی تردید کی ہے جو پرندوں کے بولنے پر اعتراض کرتے ہیں، لیکن آخر میں لکھا ہے کہ :-

> "اگر پرندوں کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کر لو کہ ہد ہد کبوتروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہد ہد ہو گا اور اس کے بولنے سے مقصود اس مضمون کا خط اس کے پاس ہونا سمجھو جیسا کہ خود اسی موقع پر قرآن مجید میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے خط دے کر اس کو ملکہ سبا کے پاس بھیجا، اسی طرح پہلے بھی خط لے کر آیا ہو گا"۔
>
> (ص ۲۱۴)

حالانکہ یہ تاویل بھی قرآن کریم کے سیاق کے لحاظ سے کسی طرح درست نہیں، اور اگر "علمنا منطق الطیر" پر ایمان ہے تو اس لیپ پوت کی ضرورت ہی کیا ہے؟

اسی طرح "قال الذی عندہ علم من الکتٰب" میں علامہ ندویؒ نے "کتاب" سے وہ خط مراد لیا ہے جو حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کے پاس بھیجا تھا، حالانکہ یہ تفسیر جمہور کے خلاف بھی ہے اور "علم من الکتاب" پر کسی طرح ٹھیک نظر نہیں آتی۔

بہرکیف! ان چند مثالوں سے یہ بتانا مقصود تھا کہ سید صاحب کی اس کتاب میں تفسیر قرآن کے معاملہ میں تحقیق و احتیاط کا وہ معیار قائم نہیں رہ سکا جو تاریخی و جغرافیائی معلومات میں نظر آتا ہے اور نمایاں طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ "فاضل مؤلف" کو جمہور مفسرین سے ہٹ کر اپنی ایک جداگانہ راہ اختیار کرنے میں کوئی باک نہیں ہے اور بسا اوقات بالکل بلا ضرورت بھی تفرد کی یہ راہ اختیار کر لی گئی ہے۔

تاہم جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ کتاب سید صاحب کے ابتدائی دور کی ہے بعد میں خود انھوں نے اپنی ایسی تحریروں سے رجوع کر لیا تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ وتغمدہ بغفرانہ

تصانیف

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

- آسان نیکیاں
- اندلس میں چند روز
- اسلام اور سیاست حاضرہ
- اسلام اور جدت پسندی
- اصلاح معاشرہ
- اصلاحی خطبات ـــــ (ا جلد)
- احکام اعتکاف
- اسلام اور جدید معیشت و تجارت
- اکابر دیوبند کیا تھے؟
- بائبل سے قرآن تک
- بائبل کیا ہے؟
- تراشے
- تقلید کی شرعی حیثیت
- جہان دیدہ ـــــ (بیس ملکوں کا سفرنامہ)
- حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق
- حجیت حدیث
- حضورؐ نے فرمایا ـــــ (انتخاب حدیث)
- حکیم الامت کے سیاسی افکار
- درس ترمذی ـــــ (۳ جلدیں)
- دینی مدارس کا نصاب و نظام
- ضبط ولادت
- عیسائیت کیا ہے؟
- علوم القرآن
- عدالتی فیصلے
- فرد کی اصلاح
- فقہی مقالات ـــــ (۳ جلدیں)
- مآثر حضرت عارفی
- میرے والد میرے شیخ
- ملکیت زمین اور اس کی تحدید
- مطابق سنت نماز کے فوائد
- نقوش رفتگاں
- نفاذ شریعت اور اس کے مسائل
- نمازیں سنت کے مطابق پڑھئے
- ہمارے عائلی مسائل
- ہمارا تعلیمی نظام
- ہمارا معاشی نظام
- تکملۃ فتح الملہم شرح صحیح مسلم ۶ جلد ـــــ (عربی)
- ما ہی النصرانیۃ؟ ـــــ (عربی)
- نظرۃ عابرۃ حول التعلیم الاسلامی ـــــ (عربی)
- احکام الاوراق النقدیۃ ـــــ (عربی)
- بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ ـــــ (عربی)

The Authority of Sunnah
The Rules of I'tikaf
What is Christianity?
Easy Good Deeds
Perform Salah Correctly

فون ۵۰۳۲۲۸۰ — مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴ — پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰